عیدگاہ سے واپسی

اسلم جمشید پوری

عیدگاہ سے واپسی

(افسانوی مجموعہ)

اسلم جمشید پوری

عیدگاہ سے واپسی

(افسانوی مجموعہ)

اسلم جمشید پوری

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

نام کتاب : عید گاہ سے واپسی (افسانوی مجموعہ)
افسانہ نگار : اسلم جمشید پوری
حرف کاری : سعید سہارنپوری
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
سرورق : اظہار احمد ندیم
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Eidgaah Se Waapsi
(A Collection of Short Stories)
by **Dr. Aslam Jamshedpuri**
Edition 2015 Price: Rs. **200/-**

Marketed & Distributed by Masooma & Co., Delhi

ملنے کے پتے
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔ 09889742811
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob:9971775969,9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

اپنے آبائی گاؤں

عالم گیر پور 'دھنورا'

(ضلع بلند شہر)

کے نام

جس نے اسلم کو اپنی

گود اور بانھوں میں

کھلایا اور پالا

اور----

اسلم جمشید پوری کو

افسانے کے لئے کردار اور

دیہی مناظر

فراہم کئے۔

——ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

فہرست

میں اور میرے افسانے

نئی کتاب کی اشاعت بڑا ہی مسرت آگیں لمحہ ہوتا ہے اور جب یہ لمحے بار بار آتے ہیں تو یقیناً مسرت ضرب ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں تو ہر کتاب کا شائع ہونا ہی اہم ہوتا ہے مگر تخلیق کار کے لیے تخلیقی کتاب کی اشاعت زیادہ خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ 'عید گاہ سے واپسی' میرا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ''افق کی مسکراہٹ'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کے تعلق سے میرے استاد پروفیسر سید احمد شمیم کا ماننا ہے:

> ''افق کی مسکراہٹ، کو میں ان کی معصوم زندگی لیکن گہرے مشاہدے پر مبنی کہانیوں کا مجموعہ سمجھتا ہوں۔ یہاں تک کہ ان کے ایسے افسانے بعض رسائل میں مجھے نظر آئے جن کی قرأت سے مجھے خود بھی حیرتوں سے گذرنا پڑا۔''

(اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے پر تبصرے سے ماخوذ)

'افق کی مسکراہٹ' کی کہانیاں ابتدائی زمانے کی کہانیاں ہیں۔ ان میں کئی جنسی زمرے کی کہانیاں بھی تھیں۔ میرے لیے یہ بات لائق اطمینان اور باعث مسرت تھی کہ ۲۲ر افسانوں اور ۱۰ر افسانچوں پر مشتمل میرے پہلے افسانوی مجموعے کو نئی نسل کے قارئین نے خوب سراہا۔ مجموعے کے کئی افسانے مرد، کشمکش، اندھیرا ابھی زندہ ہے، نہ بجھنے والا سورج، ممتا کی آواز، ترکیب، جاگتی آنکھوں کا خواب اور کئی افسانچے اشتہار، آٹو گراف، نیا فلسفہ اس وقت بھی زندہ تھے اور آج بھی افسانے کی دنیا میں گونج رکھتے ہیں۔ مجموعے کے زیادہ تر

افسانے میرے قیامِ جمشید پور کے دوران ہی قلم بند ہوئے۔

'افق کی مسکراہٹ' کی اشاعت کے بعد زندگی میں مختلف الجہات معرکہ آرائیوں کے سبب افسانے لکھنے کی رفتار میں خاصی کمی آئی جب کہ ایک وقت تھا کہ میں نے ایک ہی نشست میں تین تین افسانے، ایک سے زائد مرتبہ قلم بند کیے اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ دو تین سال میں ایک آدھ افسانہ ہی تخلیق ہو پایا۔

ابتدا میں میرے زیادہ تر افسانے اختصار کے حامل ہوتے تھے۔ جزیات نگاری کا گذر کم سے کم ہوتا تھا۔ ۲۰۰۷ء میں، میں نے دہلی خصوصاً دہلی۔۶ پر ایک افسانہ ''یہ ہے دلی میری جاں'' تحریر کیا۔ افسانے میں جامع مسجد کے گردونواح کے علاقے خصوصاً سبھاش پارک، جواب قصہ پارینہ ہو چکا ہے، (میٹرو اسٹیشن کی کھدائی میں، سبھاش پارک کا وجود ختم ہو گیا ہے۔) کی زندگی کو میں نے جزئیات کے ساتھ بیان کیا۔ نہ صرف افسانہ مقبول ہوا بلکہ میری افسانہ نگاری کا رخ ہی بدل گیا۔ انداز میں تبدیلی آئی اور یکے بعد دیگرے کئی افسانے قلم بند ہوتے چلے گئے۔ میری زندگی میں در آنے والے اس تخلیقی جھونکے نے مجھ سے کئی خوبصورت افسانے تخلیق کروائے۔ موت کا کنواں، پینٹھ، لینڈرا، تجربہ کار، نادان، چیخیں، اسی زمانے کے افسانے ہیں۔ یوں تو یہ سبھی افسانے قارئین کے مخصوص گروپ کی پسند بنے لیکن لینڈرا نے ہر طبقہ میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ لینڈرا، کو لکھتے وقت پہلی بار ایسا ہوا کہ میرے ذہن میں کہانی کا جو خاکہ تھا وہ کہانی لکھتے وقت مسمار ہوتا چلا گیا اور کہانی خود بخود اپنے نین نقش نکالتی چلی گئی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کہانی خود کو لکھوا رہی تھی۔ 'لینڈرا' ایک سے زائد رسائل میں شائع ہوئی۔ ہندوستان، پاکستان میں لینڈرا نے جو شہرت حاصل کی، وہ میرے لیے خواب کے شرمندہ ہونے جیسی بات تھی۔ اب اتنی کہانیاں ہو گئی تھیں کہ مجموعہ آسکتا تھا۔ لہٰذا پہلے مجموعے کے بارہ برس بعد ۲۰۰۹ء میں 'لینڈرا' نامی دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اس کے زیادہ تر افسانے قیامِ دہلی (۱۹۹۲ تا ۲۰۰۲) کے ہی تخلیق کردہ تھے۔ 'لینڈرا' کا اجرا جمشید پور میں سید عباس رضوی (چھبن) کی سرپرستی میں معروف

افسانہ نگار عابد سہیل اور ٹاٹا کمپنی کے آفیسر سنجے چودھری کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ میرٹھ میں 'لینڈرا' کا اجرا میرٹھ یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے کاک اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے ہاتھوں ہوا۔

''لینڈرا'' کو میں نے پانچ رنگوں میں منقسم کیا تھا۔ پہلا رنگ ذرا طویل افسانوں کا تھا۔ دوسرے رنگ میں، پہلے کی نسبت کم طویل افسانے تھے۔ تیسرا رنگ افسانچوں کا تھا۔ چوتھے رنگ میں، میں نے افسانہ نگاری کے ابتدائی عہد کے دو تین افسانے شامل کیے تھے جب کہ پانچواں رنگ میری اکلوتی، یک سطری کہانی 'زندگی' پر مبنی تھا۔ 'لینڈرا' کی اشاعت کے بعد دوستوں اور چاہنے والوں نے میرے افسانوں کو خاص پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ تبصرے اور مضامین بھی خاصی تعداد میں شائع ہوئے۔ کئی انعام بھی ملے۔ کئی یونیورسٹیز میں مقالے بھی تحریر ہوئے۔ ۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر تسنیم فاطمہ امروہوی کی ایک کتاب ''اسلم جمشید پوری بحیثیت افسانہ نگار'' شائع ہوئی۔ تسنیم نے افق کی مسکراہٹ اور لینڈرا کے ہر افسانے اور افسانچے پر اپنی رائے کا بے باکی سے اظہار کیا۔

۲۰۱۲ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے پریم گوپال متل نے ایک کتاب ''کہانی محل'' (اسلم جمشید پوری کے دس نمائندہ افسانے) ترتیب دی۔ جس پر نئی نسل کے معروف افسانہ نگار خورشید حیات نے منفرد انداز کا مقدمہ ''کہانی مشک سے پھوٹتی خوشبو'' تحریر کیا۔ کتاب کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۲۰۱۲ء ہی میں میں نے ایک تجربہ کیا ''کہانی ندی'' کے عنوان سے اپنے تین افسانے، لینڈرا، موت کا کنواں، یہ ہے دلی مری جاں اور تین افسانچے 'نشیب کی طرف'، 'نیا سال' اور 'ہم بھی انسان ہیں' اپنی ہی آواز میں ریکارڈ کرا کر ''اردو افسانے کا پہلا آڈیو البم'' تیار کیا۔ میرا اور میرے افسانوں کا تعارف خورشید حیات نے تحریر کیا جسے جامعہ ملیہ ماس کمیونی کیشن کے ڈاکٹر شکیل اختر نے اپنی آواز دی۔ کہانی ندی البم کا اجرا، سہ روزہ بین الاقوامی منٹو سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں اس وقت کے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر ایس کے کاک، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر

جہانگیر وارثی، محترم حقانی القاسمی، محترم سید فیصل علی نے مشترکہ طور پر کیا۔ افسانے کے اس نئے تجربے کا اردو دنیا میں خاصا خیر مقدم ہوا۔

اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی گاہے بہ گاہے کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ دراصل اردو کہانیوں کو ہی رسم خط کی تبدیلی کے ساتھ ہندی میں کرتا رہا۔ اس کام میں میری نصف بہتر سائرہ بانو نے خاصی مدد کی اور اس طرح افق کی مسکراہٹ کی ساری کہانیاں ہندی میں ۲۰۰۴ء میں ''جاگتی آنکھوں کا خواب'' کی شکل میں شائع ہوئیں۔ کتاب کا اجرا ہندی اردو کے نامور فکشن نگار کملیشور کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ پھر ۲۰۱۳ء میں 'لینڈرا' کی کہانیاں ہندی میں 'دکھ نکلوا' کی شکل میں سامنے آئیں۔ 'دکھ نکلوا' کی بھومیکا (مقدمہ) ہندی اردو کے معروف اسکالر اور ماہر پریم چند ڈاکٹر پردیپ جین نے تحریر کی اور پشت پر ہندی کے معروف ناقد اور کہانی کار پروفیسر گنگا پرساد وِمل کی تحریر شامل تھی۔

ابتدا ہی سے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھتا رہا ہوں۔ ۱۹۹۷ء میں مکتبہ پیام تعلیم (مکتبہ جامعہ) نئی دہلی سے بچوں کی کہانیوں کی پہلی کتاب ''ممتا کی آواز'' شائع ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں ایس آر سی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہندی میں 'عقلمند لڑکا' شائع ہوئی۔ کافی زمانے تک نور، کھلونا، امنگ وغیرہ میں کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ بعد میں بہت زمانے تک بچوں کے ادب سے تقریباً تعلق منقطع ہو گیا تھا جسے از سرِ نو قائم کرنے کا سہرا ہمارے دوست نصرت ظہیر کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے گاندھی جینتی کے موقع پر مجھ سے گاندھی پر بچوں کی کہانی ''دلظل گاندھی'' لکھوالی جسے کافی پسند کیا گیا۔ پھر ایک اور کہانی 'سچائی کا راستہ' تحریر کی۔ یہ بھی گاندھی جی کی زندگی کو پیش کرنے والی کہانی تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ ۲۰۰۸ء کے آس پاس ایک کہانی ''نادان'' لکھی۔ یہ افسانہ عجیب وغریب موضوع پر لکھا گیا اردو میں اب تک کا پہلا افسانہ ہے۔ اس میں عورت کے ان نازک معاملات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جن کے دوران عورت پر کوئی بھی عبادت فرض نہیں ہوتی۔ اتفاق ہی تھا کہ کہانی میں دو بھائی بہن مرکزی کردار میں تھے۔

لڑکے کی عمر ۱۰۔۸ ارسال ہوگی جب کہ لڑکی ۱۶۔۱۵ ارسال کی تھی۔ میں نے یہ کہانی 'ایوان اردو' میں بغرض اشاعت ارسال کی۔ میری اور میرے قریبی دوستوں کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دو تین ماہ بعد کہانی کو 'امنگ' میں دیکھا۔ دونوں رسالوں کے منتظمین ایک ہی تھے اور جس نے بھی افسانے کو پڑھا، اس نے افسانے کے موضوع کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور بچوں کے کردار کے سبب اسے بچوں کے رسالے 'امنگ' میں شائع کر دیا۔

اِدھر فرقان سنبھلی، جو خود نئی نسل کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں کی ایک کتاب ''اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے'' ۲۰۱۴ء کے اواخر میں منظر عام پر آئی ہے۔ فرقان سنبھلی نے میرے گاؤں، دیہات اور قصبات کے منظر اور پس منظر میں لکھے گئے نو افسانوں کو مرتب کیا ہے۔ کتاب میں ان کے دو مضامین اردو میں دیہی افسانوں کی روایت اور اسلم جمشید پوری کے افسانوں میں دیہات کی عکاسی' قابل مطالعہ ہیں۔ انھوں نے محنت سے میرے افسانوں کا جائزہ لیا ہے اور اردو میں دیہی افسانوں کی روایت پر اچھا مضمون لکھا ہے۔

'لینڈرا' کی ۲۰۰۹ء میں اشاعت کے تقریباً چھ سال بعد ۲۰۱۵ء میں جب میرا تیسرا افسانوی مجموعہ اشاعت کے لیے تیار ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ چلو شکر ہے کہ پہلے اور دوسرے مجموعے کی اشاعت میں ۱۲ ارسال کا وقفہ تھا جب کہ دوسرے اور تیسرے مجموعے کی اشاعت کے درمیان کا وقفہ چھ سال ہے گو کہ یہ بھی خاصا طویل عرصہ ہے پھر بھی سابقہ روایت سے انحراف تو ہے ہی۔ میرے کئی خیر خواہ اور قریبی احباب، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر شاداب علیم اور سید اطہر الدین اطہر (مرحوم) کی مجھ سے شکایت رہی ہے کہ میں تخلیقی ادب میں کم وقت دیتا ہوں۔ اب مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے تخلیقی کاموں کے لیے زیادہ وقت نکالنا چاہیے۔

افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچے لکھنا بھی میرا شوق رہا ہے۔ میرے دونوں مجموعوں میں تقریباً ۱۲۔۱۰ ارافسانچے بھی شامل تھے۔ سہ روزہ عالمی منٹو سیمینار، زیر اہتمام

،شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی ۱۵ تا ۱۷ ردسمبر ۲۰۱۲) میں بشیر مالیر کوٹلوی۔ ایم اے حق، رونق جمال، اشتیاق سعید، ایم مبین، نورالحسنین، معین الدین عثمانی اور میں نے مل کر افسانچے کے فروغ کے لیے کمر کس لی۔ ایک تنظیم ''آل انڈیا افسانچہ اکیڈمی کا قیام بھی میرٹھ میں عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں، میں نے افسانچے پر کئی مضامین قلم بند کیے۔ پھر میں نے اپنے افسانچوں کو مجموعے کی شکل میں شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا اور کولاژ (۲۰۱۴ء) کی شکل میں یہ خواب بھی پورا ہوا۔ مجموعے میں کل ۳۸ ر افسانچے شامل ہیں۔ یہ میرے تقریباً ۳۲ ر سالہ سفر کے دوران تخلیق ہوئے۔ یہی نہیں کتاب میں معروف ناقد و صحافی محترم حقانی القاسمی کا میرے افسانچوں پر خاصا وقیع مضمون اور افسانچے کے فن، تاریخ اور ارتقاء پر میرا ایک طویل مضمون بھی کتاب میں شامل ہے۔ جسے کافی سراہا گیا۔

نیا مجموعہ 'عیدگاہ سے واپسی' آپ کے ہاتھوں میں ہے، میں نے موقع غنیمت جانا اور پہلی بار اپنے افسانوں پر خود قلم اٹھالیا۔ خود کی تخلیق کے تعلق سے کچھ بھی لکھنا کتنا عجیب لگتا ہے؟ لیکن زمانہ بدل رہا ہے۔ اب افسانہ نگاروں کا ایک گروہ اس کا نہ صرف طرف دار ہے بلکہ اسے اپنا حق سمجھنے لگا ہے۔ آپ نہ گھبرائیں۔ میں آپ کو ایسے کسی عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو اپنی ہر کہانی کے تعلق سے کچھ اِدھر کچھ اُدھر کی یعنی ان کے وجود میں آنے کے اسباب کا بیان کروں گا۔

'عیدگاہ سے واپسی' کے سارے افسانے میرٹھ کی سرزمین پر تخلیق ہوئے ہیں۔ مجموعے کی پہلی کہانی ''پانی اور پیاس'' ہے۔ شعبے میں اختر آزاد آئے تھے۔ طالب علموں کو کہانی 'پانی' سنا رہے تھے۔ کہانی میں اختر نے بڑی ہنرمندی سے جنوب کی دو ریاستوں کے درمیان آبی تقسیم کے مسئلے کو لفظوں اور جملوں میں ڈھالا تھا۔ کہانی سنتے ہوئے میرے ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی۔ پانی پر لکھی گئی کوئی کہانی، کربلا کے منظر یا پس منظر کو نہیں سمیٹتی ہے تو وہ مکمل نہیں۔ یہ ایک اضافی خیال تھا۔ اختر کی کہانی بہت اچھی تھی لیکن ذہن میں پانی اور کربلا کے انسلاک نے انگڑائی لینی شروع کردی اور ایک شب ''پانی

اور پیاس' اپنے پورے جسم کے ساتھ وجود میں آچکی تھی۔

''بدلتا ہے رنگ آسماں......'' میرا تعلق بلند شہر کے موضع عالم گیر پور دھنورا سے ہے۔ میرے بچپن کا خاصا حصہ اسی گاؤں میں گذرا ہے۔ اکثر شادی بیاہ میں ہندو، مسلم مل کر سارے انتظامات کرتے تھے۔ شادی کے دوران ہی پولس کے بھیس میں ایک بہروپیہ آتا۔ اپنی رعب دار آواز، مسخرے پن اور بولنے کے فن سے لوگوں کو کبھی ڈراتا، کبھی ہنساتا اور کبھی اپنے فن کا قائل کرتا۔ ذہن کے گوشے میں یہ کردار گھومتا رہتا تھا۔ اچانک ایک دن بہروپیے کا وہ کردار ذہن سے نکل بھاگا۔ میں نے بہت تلاش کیا پر مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ پھر میں نے دیکھا کچھ ہی دن بعد بہروپیہ ظفرو کا ڈھونگ رچ کر میری کہانی ''بدلتا ہے رنگ آسماں....'' کا ہیرو بنا ہوا تھا۔

''عیدگاہ سے واپسی'' غالباً چوتھی یا پانچویں میں اردو کی کتاب میں 'عیدگاہ' کہانی پڑھی تھی۔ حامد کی معصومیت کا فولاد، چمٹے کی شکل میں ذہن کے کسی گوشے میں چپکا ہوا تھا۔ بی اے میں پھر 'عیدگاہ' پڑھی، اب کچھ اور تفہیم واضح ہوئی۔ پتہ چلا کہ کہانی صرف حامد اور دادی سکینہ کی بے مثل محبت کی ہی نہیں ہے بلکہ پورے اسلامی معاشرے اور تہذیب کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماجی تقسیم اور معاشی حالات کی غمازی کرنے والی کہانی ہے۔ ایک دن یوں ہی بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ آج اگر پریم چند ہوتے اور انہیں عیدگاہ لکھنی پڑتی تو وہ کیا لکھتے؟ ایک اور خیال آیا کہ عیدگاہ کی تخلیق کے ۷۰ رسال بعد اگر از سر نو عیدگاہ تحریر کی جائے تو کیسا لگے گا۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ عیدگاہ کے ۷۰ رسال بعد ملک کے موجودہ حالات خصوصاً بابری مسجد شہادت، گجرات فساد اور روز بہ روز کے بگڑتے حالات میں عیدگاہ لکھوں گا۔ پھر ایک خیال آیا کہ پریم چند کی عیدگاہ کا منظر اور پس منظر شہر ہے، میں اسے دیہات کا پس منظر دوں تو کیسے لگے گا؟ اور ان تمام خیالات نے مل کر ننھے حامد کو ۷۰ رسال کا بوڑھا بنا دیا اور اب وہ موجودہ حالات میں عیدگاہ کیسے جاتا ہے اور پھر کس طرح واپس آتا ہے۔ یہ سب 'عیدگاہ سے واپسی' میں آپ کو ملے گا۔

تیری سادگی کے پیچھے (۱) اور تیری سادگی کے پیچھے (۲) یہ دونوں کہانیاں دراصل ایک تجربے کا حصہ ہیں۔ شاہ رخ خان کی فلم ڈان۔۲ آئی جو امیتابھ کی فلم ڈان کا سیکول تھی۔ خرافاتی ذہن نے سوچنا شروع کیا۔ افسانے میں ایسا کیوں نہیں؟ بس پھر کیا تھا۔ ذہن نے منصوبے بنانا شروع کردیے۔ کبھی خیال آتا کہ ایسے سیکول افسانے کی پوری ایک سیریز ہو جس کی خوبی یہ ہو کہ ہر افسانہ اپنے آپ میں مکمل ہو، جدا بھی اور ایک دوسرے سے مربوط بھی ہو۔ بس پھر کیا تھا، ایک معروف مکھڑا ''تیری سادگی کے پیچھے'' انگڑائی لینے لگا۔ یہ اصل میں جمشید پور کے ایک معروف قوال مجید شعلہ کی ایک قوالی کا مکھڑا ہے۔ مجھے لگا آج سماج میں ہر طرف سادگی کا ڈھونگ کرنے والوں کی بھیڑ ہے۔ کیوں نہ اس سیریز کو اس پر مبنی رکھا جائے اور پہلا افسانہ تحریر ہوا جس میں حشمت ضیا، نام کے معروف فکشن نگار کی دوہری زندگی کو دکھانے کی کوشش کی۔ اختتام پر پہنچ کر افسانہ نیا موڑ اختیار کر لیتا ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار ایک کالج طالبہ ثانیہ، دہشت گردوں کی گاڑی کے حادثہ کا سبب بن جاتی ہے۔ سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے۔ ثانیہ بچ جاتی ہے۔ زخمی حالت میں گرفتار کر لی جاتی ہے۔ پولس اسے دہشت گردوں کا ساتھی سمجھتی ہے، پہلے اسپتال اور پھر طویل مدت کے لیے جیل ثانیہ کی قسمت بن جاتی ہے۔

کہانی کے دوسرے پارٹ میں کافی زمانے بعد سرکار کی تبدیلی کے سبب جیلوں میں قید بے قصور مسلمانوں کی رہائی ہوتی ہے۔ ثانیہ بھی سات سال بعد باہر آتی ہے۔ اب وہ ثانیہ سے سونیا بن چکی ہے۔ سونیا کی رہائی ایک بہت بڑے مذہبی گرو کے اشارے پر ہوتی ہے اور اس طرح سونیا بابا کے آشرم میں پہنچ جاتی ہے۔ آشرم کی گھنونی زندگی کا حصہ بن کر اسے اپنے آپ پر شرم آتی ہے اور وہ اس طرح پورے نظام کے خلاف لڑتی ہے۔

'راستہ' بہت چھوٹی سی ایک کہانی ہے۔ میں نے بے روزگاری کا کرب ایک طویل عرصے تک جھیلا ہے۔ بے روزگاری کی تصویر کشی اور بے روزگاری کا حل، میری کئی کہانیوں میں ہے۔ مشورہ، ترکیب، آئیڈیا جیسی کہانیاں اس کی مثال ہیں۔ راستہ بھی اسی

قبیل کی کہانی ہے۔لیکن یہ کہانی ایک مضطرب ، پرجوش ، بے روزگار کروڑ پتی بننے کے خواہاں نوجوان کو جونسخہ بتاتی ہے وہ اسے قبول نہیں ہے۔

'بے آبرو' میں پہلی بار اپنی گھریلو زندگی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔گھر میں جہاں بہت سارے مسائل ہیں، وہیں خادماؤں کی عدم دستیابی، ان کی غیر حاضری، ناز نخرے آج کل ہر گھر کے مسئلے ہیں، جب ایک خادمہ نے اپنے ہٹائے جانے کا بدلہ یوں لیا کہ آکر کام جوائن کرلیا اور دو دن بعد خود کام چھوڑ کر چلی گئی تو سمجھ میں آیا کہ اب اس کی انا کو تسلی ہوئی ہے۔گھر، خادمہ، شوہر، بیوی، بچوں کے اس ڈرامے کو بے آبرو میں پیش کیا ہے۔

'لمبا آدمی' ایک عجیب کہانی ہے۔ بہت پہلے میں نے دہلی۔۶ پر ایک کہانی لکھی تھی جس میں پہلی بار کہانی میں جامع مسجد اور گرد ونواح کے علاقے کے جغرافیہ اور تہذیب و تمدن کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی جسے لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ یہی تجربہ میں نے ایک اور کہانی 'تجربہ کار' میں کیا۔اس میں بھی دہلی کا جغرافیہ اور تہذیبی احوال شامل تھا۔اس سلسلے کی تیسری کہانی ''موت کا کنواں'' تھی جس میں میرٹھ کے نوچندی میلے کی رونق، حال احوال اور تہذیبی وثقافتی زندگی کو افسانے کا حصہ بنایا تھا۔'لمبا آدمی' اسی سلسلے کی ایک کہانی ہے۔

بلند شہر جو میرا آبائی علاقہ ہے، میری کئی کہانیوں میں مختلف شکلوں میں موجود ہے۔لیکن اب تک میں نے بلند شہر کے دیہات کی عکاسی کی تھی 'لمبا آدمی' میں، میں نے پہلی بار بلند شہر کے شہری جغرافیہ کو پیش کیا ہے۔ ہر سال جنوری رفروری میں لگنے والی نمائش بلند شہر کی شناخت ہے۔کہانی اسی نمائش سے شروع ہو کر افریقہ چلی جاتی ہے اور پھر نمائش میدان میں اختتام کو پہنچتی ہے۔پہلی بار ایک ایسا کردار میں نے استعمال کیا ہے جو غیر ملکی ہے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا ہے۔

'بنتے مٹتے دائرے' ہندی کہانیوں میں دلت کے موضوع پر لکھی گئی متعدد کہانیوں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔گاؤں کے پس منظر میں وقوع پذیر ہونے والی یہ کہانی دلتوں پر ہونے والے مظالم کی داستان ہے۔لیکن جیسے جیسے سماجی اور سیاسی بیداری آئی ہے اب پسماندہ

طبقات میں بھی ایک نیا جوش آ گیا ہے اور ان میں اتحاد و اتفاق کا ایسا جذبہ پیدا ہوا ہے کہ ایک بڑا محاذ بن گیا ہے۔ کہانی میں پسماندہ طبقات کے اندر آنے والی سماجی و سیاسی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہے۔

''ایک ادھوری کہانی''میں، میں نے میرٹھ کے ایک ادبی دوست اور ان کی بیگم کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس کہانی نے میں قصبے کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کو پیش کرنے والی یہ کہانی ہر مکمل کہانی کو ادھورا ثابت کرتی ہے۔ دنیا کی ہر کہانی ادھوری ہے، ہر کردار فانی ہے۔ وہ دنیا میں آ کر اپنا اپنا رول ادا کر کے ادھوری کہانی کو مکمل کرنے کی کوشش کرتا ہوا روانہ ہو جاتا ہے۔ کہانی نامکمل ہی رہ جاتی ہے۔ لیکن کہانی ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ اور تکمیلیت کے درجے کو حاصل کرے گی

'دن کے اندھیرے، رات کے اجالے' ایک تجرباتی کہانی ہے۔ اس افسانے میں قبرستان مرکزی کردار کے طور پر سامنے آیا ہے۔ یہ قبرستان فرضی نہیں ہے۔ اس قبرستان کے اوپر اور نیچے آباد لوگ جس گاؤں کے ہیں، اس سے میرا گہرا تعلق ہے۔ کہانی کے دیگر کردار بھی میرے سگے اور رشتہ دار ہیں۔ یہ کہانی حقیقت کا افسانوی روپ ہے۔

''ہوئے تم دوست جس کے'' شہروں کی تہذیب اور اس کے جغرافیہ کی جھلک اپنے اندر رکھنے والی یہ کہانی بھی اسی سیریز کا حصہ ہے جس کے تحت دہلی، میرٹھ، بلند شہر پر کہانیاں وجود میں آئی ہیں۔ ''ہوئے تم دوست جس کے'' ایک رومانی انداز کی کہانی ہے۔ اس میں الہ آباد کی تہذیب و ثقافت اور جغرافیہ کی ایک جھلک آپ کو نظر آئے گی یہ ٹرین کے ایک سفر کا قصہ ہے۔

ایک ضروری وضاحت اور۔۔۔ میں نے کتاب کی پروف ریڈنگ کرتے وقت اپنے زیادہ تر افسانوں کے متن میں تبدیلی بھی کی ہے۔ لہٰذا آپ تمام سے گذارش ہے کہ ان افسانوں کا کہیں حوالہ دیا جائے تو اس کتاب کے مضامین سے ہی متن اخذ کیا جائے۔

''عیدگاہ سے واپسی'' مجموعے میں کل ۱۲/افسانے ہیں۔ بارہ افسانوں کا یہ مجموعہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے، تبصرہ اور تنقید میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ، مجموعے کے دو چار افسانے آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔ ایک افسانہ بھی آپ کو پسند آتا ہے تو یہ میری کامیابی ہوگی۔

□□□

بدلتا ہے رنگ آسماں

بہت تیز آواز کے ساتھ ایک گولا آسمان کی بلندیوں میں جا کر پھٹا۔ آسمان پر رنگ برنگے ستارے دائرے میں پھیل گئے گویا ستاروں سے سجی ایک بہت بڑی گیند آسمان پر لمحہ بھر کو ٹھہر گئی ہو۔

''ارے شرپھو! او شرپھو، دیکھ بارات آ گئی ہے۔''

''ہاں ساموا! گولے تو بڑے جاندار لگے ہیں۔ کتنی جبر دست آواج ہے اور کتنی لیٹ آکاس پر پھوٹی......؟''

گاؤں کے دو کم عمر ہندو۔ مسلم دوستوں نے گاؤں میں بارات کی آمد کی خبر پاتے ہی، پہلے اپنی ٹولی اور پھر ٹولی نے سارے گاؤں میں خبر پھیلا دی، رام دین کی بیٹی آشا کی بارات آ گئی ہے۔

گاؤں دھنورا، میں بارات آنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ہزاروں باراتیں آ چکی تھیں، ایک سے بڑھ کر ایک... کسی بارات میں گلاؤٹھی کا مشہور بینڈ، کسی میں جہانگیر آباد کی نوٹنکی، کسی میں نچکیے لاجواب، کسی میں گھوڑ سوار بینڈ باجے.... بارات کے گاؤں کی سرحد میں داخل ہوتے ہی، گولے داغ کر بارات کی آمد کی خبر دی جاتی۔ گاؤں کے لوگ جو کئی دن سے بارات کی آمد کی راہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، گولے کی آواز پر بزرگوں اور نوجوانوں کا ایک گروہ بارات کو لینے کے لیے، گاؤں کے باہر جاتا ہے۔

''ارے رام دین! بابا اسماعیل کاں ہیں؟ بارات کی اگوائی کو انہن لے چلو، اُن سُو بڑّ و تو کوئی اور نہ دِیکھے ہے۔''

''ہاں..... ہاں.....کا کا بلدیو، اسماعیل بابا کو اور ان کو بھی لے لیو۔''

بابا اسماعیل، کا کا بلدیو، تر کھا بابا، رام پال سنگھ فوجی، آشارام تیاگی، شیخ نثار احمد اور نوجوانوں کا ایک ٹولہ بارات کے استقبال کے لیے روانہ ہوا۔

گاؤں کے باہر بارات کے لوگوں سے ہاتھ ملائے گئے۔ بابا اسماعیل سب سے بڑے تھے، انہوں نے شگن کے سوا روپے رام دین کے سمدھی، مہندر سنگھ کے ہاتھوں میں رکھے اور بولے۔

''آجاؤ بھئی۔ گام میں آپ کو، سواگت ہے......''

ایک ساتھ کئی گولے آسمان کو آواز اور روشنی سے چیرتے چلے گئے۔ کچھ نے کانوں میں انگلیاں دے لیں تو کچھ نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ اُدھر دن رات کا ملن جاری تھا۔ تارے اور چاند بھی سیاہ غازہ اپنے چہروں پر مل کے مزید روشن ہو رہے تھے۔ گویا بارات میں چلنے کی تیاری کر رہے ہوں۔ بارات سج چکی تھی۔ آگے آگے سروں پر ہنڈوں کو لیے دو طرفہ قطار میں مزدور مرد۔ عورت، ان کے پیچھے ڈھول تاشے لیے باجے والے، ان کے پیچھے نوجوانوں کی رقص کرتی ٹولی.....جس کے پیچھے آر کے شرما بینڈ پر ناچتے گاتے نوجوان.......ان کے پیچھے لڑکیوں کی ناچتی ہوئی دو جوڑیاں.....سب جانتے تھے کہ یہ لڑکیاں تو بس نقلی ہیں، اصل میں یہ لڑکے ہوتے تھے جو لڑکیوں کا بھیس بدل کر خوب ناچتے اور نوٹ بٹورتے تھے۔ ان کے پیچھے ایک بڑی بگھی میں دولہے راجا اور ان کی بغل میں ان کا پیارا سا کم عمر بھانجا........سب سے پیچھے بزرگ.....گانوں، باجوں، ناچ کھیل کے ساتھ بارات دھوم دھام سے سارے گاؤں کی گلیوں سے گذرتی رہی۔ چھتوں پر لڑکیاں اور عورتیں ایک کے اوپر ایک، بارات کی دھوم دھام اور دولہے کو دیکھنے کے لیے بے تاب کھڑی تھیں۔

شام کو گاؤں میں داخل ہونے والی بارات گھنٹوں گاؤں کی گلیوں اور چوراہوں سے گذرتی ہوئی اسکول کے احاطے میں آ گئی تھی۔ جہاں پہلے ہی سے پچاسوں چار پائیاں (جو گاؤں کے ایک ایک گھر سے جمع کی گئی تھیں)، اُن پر گاؤں کے گھروں سے اکٹھا کی گئی

چوئی اور دوتئی بچھائی گئی تھیں۔ بیچ میں بڑے سے حصے میں زمین پر کپڑے بچھائے گئے تھے۔ اسکول میں داخل ہوتے ہی بارات کے گانے، ڈھول تاشے سب اچانک بند ہو گئے تھے گویا بجلی کا ٹرانسفارمر جل گیا ہو۔ سر پر سے مانوشور کی ایک چادر سی اتر گئی تھی۔ اسکول کے احاطے میں آتے ہی سب نے لپک کر چارپائیاں ہتھیالی تھیں۔ بزرگوں نے خود کو ایک طرف کر لیا تھا۔ حقہ بجانے والے آمنے سامنے کی چارپائیوں پر قبضہ جما چکے تھے۔ چارپائیوں کے درمیان میں حقے رکھے تھے، جو تازہ دم بھی تھے اور چلم میں اُپلوں کی آگ بھی۔ جنہیں چارپائی نہیں ملی وہ بیچ کے حصے میں زمین پر پسر گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بالٹیوں اور گلاسوں کے ساتھ لڑکوں کا ایک ٹولہ آیا۔ کسی بالٹی میں دودھ، کسی میں پانی اور کسی میں دودھ۔ روح افزا کا شربت، بارات کا استقبال ہو رہا ہے۔ اپنی اپنی پسند کے مشروب پئے جا رہے ہیں۔ حقے کی گڑگڑاہٹ اور دھوئیں کے ننھے ننھے بادل ادھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ احاطے کو روشن کرنے کے لئے گیس کے ہنڈے جابجا رکھے تھے۔

''یہ کون نانجار ہے جو دھنورہ میں بارات لے کر آیو ہے۔''

ایک تیز چیختی ہوئی آواز نے خاموشی کے چہرے پر طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ باراتیوں نے دیکھا ایک پولس والا، خاکی وردی میں ملبوس، شانے پر تھری اسٹار، سر پر خوبصورت سی کیپ، کمر میں روالور کی پٹی اور ہاتھ میں چمچماتی ہوئی بینت .... چھ فٹ کا دراز قد، خوبرو نوجوان، اپنے ہاتھ کی اسٹک کو گھماتا ہوا دولہے کے باپ کو تلاش کر رہا تھا۔

''کون ہے بھئی مہندر سنگھ........'' تم نے کس کی آ گیا سو، دھنورہ گاؤں میں گولے داگے۔''

اپنی اسٹک گھماتا ہوا وہ چارپائیوں کے ادھر اُدھر غضبناک نظروں سے ایک ایک چہرے کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چھوٹے بچوں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ان کی گھگھی بندھ گئی تھی...... کسی ایک نے مہندر سنگھ کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا... پولس والا لپکا۔ اسٹک کو چارپائی پر مارتا ہوا دہاڑا۔

''ہاں بے سمدھی، بتا بارات نے گولے کیوں داگے۔''

''حضور غلطی ہوگئی۔ معاف کردیو۔'' سمدھی نے گھبرا کر معافی مانگ لی۔

''کوئی معافی وافی نہیں۔ جرمانو بھرو......لاؤ دوسو روپے نکالو۔''

مہندر سنگھ نے دھوتی کی انٹی میں رکھے روپے نکالے اور گن کر پولس والے کے حوالے کردیے۔

''ٹھیک ہے بھئی سمدھی، اب پٹاخے چھوڑو یا گولے داگو......''

پولس والا پاؤں پٹختا ہوا، اسکول سے باہر چلا گیا۔

اتنے میں گاؤں کے لڑکوں کی ایک ٹولی آئی۔

''آہا......بن گئے نا اُلو، ارے وہ کوئی پولس والا نہ تھا وہ تو اپنا چھجر و تھا۔ اہا..... ہا ہا.....''

ٹولی چلی گئی تھی۔ باراتی خود کو لٹا ہوا محسوس کر رہے تھے گویا کسی نے سارے باراتیوں کی جیب پر ہاتھ صاف کردیے ہوں۔

ظفر الدین، گاؤں دھنورا میں آباد شیخ خاندان کا ایک لڑکا تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ اُسے جفرو (ظفرو) کہتے تھے۔ ظفر الدین نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اس نے اپنے باپ فقرو (فخر الدین) کو دو کام کرتے دیکھا تھا۔ ایک تو وہ پورے گاؤں کے حقوں کے نیچے باندھنے کا کام کرتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے نیچے بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ وہ حقے کی ساخت اور سائز کے مطابق نیچے تیار کرتے تھے۔ پہلے ایک پتلے بانس کی نلکی کو دوسرے سے جوڑتے، ایک نلکی جس پر چلم رکھی جاتی اس کی گردن موٹی ہوتی تھی۔ دوسری نلکی حقہ پینے والے کے منہ کی طرف جاتی تھی، وہ اتنی لمبی ہوتی تھی کہ چارپائی پر بیٹھ کر آسانی سے حقہ گڑگڑایا جا سکے۔ دونوں نلکیوں کا میل حقے کی فرشی میں ہوتا تھا۔ نلکی کے اوپر رنگ برنگے کپڑے لپیٹے جاتے اور پھر ریشم کے خوبصورت دھاگوں سے کپڑے کو سختی سے باندھا جاتا۔ فخرو کے بندھے نیچے کئی بار انعام جیت چکے تھے۔ اس کے والد کا دوسرا

کام 'بہروپیئے' کا تھا۔ وہ شادیوں، سوانگ، نوٹنکی وغیرہ میں مختلف بھیس بدل کر بہروپیئے کا رول کرتے تھے۔ ان دو کاموں سے ہی فخرو نے آٹھ آٹھ اولادوں کو پالا تھا۔ ظفرو بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اُس نے اپنے والد سے بہروپیئے کا ہنر سیکھا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ گھبرا جاتا تھا۔ آواز ساتھ نہیں دیتی تھی۔ جب پہلی بار اس کے والد نے اُسے شرابی کے بھیس میں گھر پر ہی رول کروایا تو وہ بیچ میں ہی اٹک گیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے بولنے کی خوب مشق کی تھی۔ اب وہ کسی بھی جلسے میں تابڑ توڑ بول سکتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں اس نے ایک نوٹنکی میں جوکر کا کردار ادا کیا تھا۔

''حضور، حضرات، مہربان، قدردان، بندہ آپ کو آداب بجالاتا ہے۔ میں ایک جوکر ہوں، ۔ جو، کر یعنی، جو کہتا ہوں، کرتا ہوں، جی ہاں......میں آپ کو اپنی اصلیت بتاتا ہوں۔ میں ایک بہت بڑا رئیس ہوں۔ میرے گھر پر تین ہزار چھپکلیاں، دو ہزار مینڈکیاں، ایک ہزار چوہیاں، دودودھ کی نہریں بہاتی ہیں۔ نہر میں ہزاروں مچھر اور مکھیاں ڈبکیاں لگا لگا کر نہاتے ہیں لیکن دودھ پھر بھی صاف رہتا ہے۔ دروازے پر لاکھوں کنکھجورے پہرہ دیتے ہیں، مجال ہے جو کوئی بھی گھر کے اندر داخل ہو جائے.........''

تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور واہ واہی کے درمیان وہ اسٹیج سے اتر آیا تھا۔ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے....ایک تو اس کا لباس، گویا بانس پر کپڑے ٹانگ دیے ہوں، دوسرے اس کا تیز ترین رفتار سے بولنا، سارا گاؤں، بلکہ آس پاس کے علاقے میں اس کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ اب اُسے کام بھی خوب ملنے لگا تھا۔ گاؤں میں آنے والی باراتوں میں تو وہ کسی نہ کسی بھیس میں ضرور جاتا تھا اور اپنا ہنر دکھا کر خوب پیسے بٹورتا....وہ اپنے والد کا نام روشن کرنا چاہتا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو پڑھانا چاہتا تھا۔ وہ خود تو بالکل نہیں پڑھ پایا تھا، بس تقریری مشق نے اُسے مختلف لب و لہجے میں بولنے میں مہارت عطا کر دی تھی، جو اس کا ذریعہ مُعاش تھا۔ وہ اپنے کام سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا تھا۔ دور دراز کے گاؤں سے اُسے نیوتا آتا تو وہ ضرور جاتا۔ ایک دن گاؤں میں ایک سیاسی لیڈر کا جلسہ تھا۔

پارٹی کے لوگوں نے ظفرو کو پہلے ہی خبر کر دی تھی۔ انہیں بھیڑ جمع کرنے سے مطلب تھا اور ظفرو کو پیسے چاہئے تھے۔ اُس نے عام دنوں سے زیادہ پیسوں کی مانگ کی تھی، جسے منظور کر لیا گیا تھا۔

گاؤں کی چوپال پر اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے کچھ چار پائیاں پڑی تھیں۔ سامنے دری بچھی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ آنے لگے تھے۔

ڈھول کی تھاپ کے ساتھ ظفرو اسٹیج پر وارد ہوا۔ آج اُس نے قصہ گو چور کا روپ دھارا تھا۔ تالیوں سے اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس کا حلیہ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے سفید دھوتی کے اوپر لال شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر منڈاسہ، بڑی بڑی مونچھیں اور پیر میں دو پٹی کی چپل...

''ہاں تو میرے مہربان، قدر دان بھائیو اور بہنو.........لو میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں..........''

ظفرو کو سننے کے لیے بھیڑ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ظفرو اسٹیج پر تھا اور سامنے سینکڑوں لوگ بیٹھے تھے۔ لڑکوں کا ٹولہ الگ، بڑے بوڑھوں کا گروہ الگ، لڑکیوں اور عورتوں کی ٹولی الگ۔ سب کی نظریں ظفرو کی حرکات پر تھیں۔

''ایک دفعہ میں ایک شکار پر گیا۔ گھنا جنگل اور میں اکیلا۔ شائیں شائیں کرتی ہوا۔ پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ دل میں دہشت پیدا کر رہی تھی۔ شام کا وقت ہو چلا تھا اچانک پاس کی جھاڑیوں میں حرکت ہوئی، میں فوراً پیچھے گھوما (یہ کہتے ہوئے وہ اچانک پیچھے کی جانب گھوم گیا) ڈر کا جھونکا مجمع پر ادھر سے اُدھر گذر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک خوبصورت ہرن، قلانچیں بھرتا دور کو بھاگ رہا ہے۔ میں نے ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔''

قصہ سناتے سناتے وہ اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ ٹہلتا ٹہلتا وہ لوگوں کے درمیان جا پہنچا.....

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا برق رفتار ہو گیا تھا،

لیکن ہرن گھوڑے سے خاصا آگے دوڑ رہا تھا.....دوڑتے دوڑتے.......اچانک ہرن کو ٹھوکر لگی.....وہ گر پڑا، میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ ہرن کے قریب پہنچا تو دیکھا ہرن زخمی ہوا پڑا ہے۔ میں گھوڑے سے اترا، گھوڑے کو چھوڑا۔ آہستہ آہستہ دبے قدموں، ہرن کی طرف بڑھنے لگا۔''پورے مجمع پر سناٹا طاری تھا۔ظفر وان کے درمیان آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا فلم کا کوئی منظر نظروں کے سامنے زندہ ہو گیا ہو۔

''ارے یہ کیا۔ میں نے دیکھا ہرن اچانک غائب ہو گیا تھا۔میرے تو ہوش اُڑ گئے۔آس پاس سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔میرے جسم پر خوف کے کانٹے اُگ آئے تھے۔میں تھر تھر کانپنے لگا۔مجھ میں پیچھے گھومنے کی ہمت نہیں تھی۔بڑی مشکل سے پیچھے گھوم کر دیکھا تو میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا، میرا گھوڑا بھی غائب تھا........''

قصہ گو سے اُٹھنے والی ڈر کی لہروں نے سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔سارا مجمع گویا پتھر کے بتوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔سب نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ظفر و نے خاموشی اور سناٹے کا فائدہ اُٹھا کر کئی لوگوں کی گھڑیاں اور دوسرے قیمتی سامان صاف کر دیے تھے۔

''لو قصہ ختم.........''ظفر و نے زور سے آواز لگائی۔آنکھوں نے دیکھا ظفر و اسٹیج پر چہل قدمی کر رہا تھا۔اس کے ہاتھوں میں چرایا گیا سامان تھا۔لوگ حیران تھے۔انہیں علم ہی نہیں ہوا کب ظفر و نے ہاتھ کی صفائی دکھادی۔ظفر و نے سب کا سامان واپس کر دیا۔لوگ اپنی مرضی اور خوشی سے ظفر و پر پیسوں کی بارش کر رہے تھے۔ادھر نیتا جی کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی آ گئی۔

وقت گذرتا رہا۔ظفرِو کی شادی ہو گئی تھی۔اس کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔بہن بھائیوں کی شادی بھی کسی طرح ظفر و نے کر دی تھی۔ظفر و کی بیوی نوری نے دو خوبصورت جڑواں بیٹے پیدا کیے۔دونوں بہت خوبصورت تھے۔ظفر و اپنی بیوی، بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا چاہتا تھا۔وہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا۔اس نے زیادہ

محنت شروع کر دی تھی۔ اب وہ سرکس اور میلوں میں بھی اپنے کرتب دکھانے لگا تھا۔

ظفرو نے میلے میں اپنا شو شروع کیا۔

اس نے ڈکیتوں کے ایک گروہ کا منظر پیش کیا تھا۔ وہ خود گبر سنگھ بنا تھا۔ اپنے کئی دوستوں کو ڈکیت بنایا تھا۔ سارے گروپ کا بہروپ ڈکیتوں جیسا بنانے پر ظفرو نے خاصی محنت کی تھی۔ اس نے نقلی روالور، بندوقیں اور فوجی لباس کا انتظام کیا تھا۔ اُس نے اسٹیج پر ٹہلنا شروع کیا۔ فوجی بیلٹ کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ گرج رہا تھا۔

''سور کے بچو! سوچا تھا سردار سباشی دے گا۔ سارا نام مٹی میں ملائے دیو... تمہیں سزا ملے گی.....ضرور ملے گی۔''

''سرکار ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔''

''تو اب گولیاں کھاؤ..........''

ظفرو نے اپنے نقلی روالور سے گولی داغی۔ گولی کی آواز، دھماکہ بن کر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے، اُچھل رہے تھے۔ عین اُسی وقت میلے میں ایک اور دھماکہ ہوا۔ شہر کی معروف ہستی حاجی سبحان کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ پورے میلے میں بھگدڑ مچ گئی، جس کا سر جہاں سما رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔ کہاں کا اسٹیج، کہاں کا گبر۔ کھیل دکھانے والے رہے نہ دیکھنے والے۔ میلے میں دہشت پھیل گئی۔ پولس نے میلے کے راستوں پر پہرہ سخت کر دیا تھا۔ دھر پکڑ اور گرفتاری میں ظفرو پولس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس نے بہت منت سماجت کی کہ وہ تو تماشہ دکھا رہا تھا۔ گبر کا رول کر رہا تھا۔ لیکن پولس نے ایک نہ سنی، ظفرو کا ڈکیتوں والا لباس، روالور اور بندوق ثبوت کے لیے کافی تھے۔

اگلے دن اخبارات کی سرخیاں تھیں۔

''پاکستانی دہشت گرد ظفر گرفتار۔''

''حاجی سبحان کا قتل کرنے والا پاکستانی گرفتار۔''

''آئی ایس آئی کے ایجنٹ کی گرفتاری، میلے میں فائرنگ کر شہر میں فساد کرانے کا

منصوبہ تھا۔‘‘

پولس ریمانڈ میں ظفر و کو جو اذیتیں دی گئیں، ان سے مزید نہ گذرنے کے لیے اُس نے اقبال جرم کرلیا تھا کہ زندگی کے نجانے کتنے روپ ہیں اور ابھی اُسے کتنے بہروپ اختیار کرنے ہیں، اُسے پتہ نہیں تھا۔

□□□

پانی اور پیاس

اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔

چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، شاید بجلی چلی گئی تھی۔ گرمی کے سبب ہی آنکھ کھلی تھی۔ اُس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ آنکھیں ملیں۔ بستر سے نیچے اُترا۔ ٹٹول ٹٹول کر موبائل تلاش کیا۔ آن کر کے وقت دیکھنے کی کوشش کی تو آنکھیں چندھیانے لگیں۔ آنکھوں کو ملا اور وقت دیکھا۔ رات کے 3/ بجے تھے۔ پیاس کا احساس ہوا۔ مئی کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی۔ پانی کا جگ خالی تھا۔ شاید رات میں پانی ختم ہو گیا تھا۔ روم پاٹنر کا بیڈ خالی تھا۔ وہ دو دن قبل ہی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ دراصل ہاسٹل میں یہ اس کا پہلا سال تھا۔ اس کے امتحان ابھی باقی تھے۔ اسی سبب اُس نے یونیورسٹی انتظامیہ کی بار بار وارننگ کے باوجود کمرہ خالی نہیں کیا تھا۔ 125/ کمروں کے ہاسٹل میں اب صرف 12-10 کمرے ایسے تھے جو آباد تھے۔ ان میں زیادہ تر ایسے بچے تھے جو پڑھائی تو برائے نام کرتے تھے، ان کا کام یونیورسٹی میں سیاست کرنا تھا۔ ہر وقت رجسٹرار اور وائس چانسلر آفس کے آس پاس منڈلاتے رہتے۔ دن بھر کبھی جلسہ، کبھی جلوس، کسی معاملے کو لے کر ''وائس چانسلر مردہ باد'' کے نعرے لگاتے۔ طلبا کے مسائل کو لے کر وائس چانسلر کا گھیراؤ کرنا، ان کا روزمرہ کے کاموں میں شامل تھا۔ مشہور تھا کہ یہ ان کا کام یعنی پیشہ تھا۔ سننے میں تو یہاں تک آتا رہتا ہے کہ ان کے زیادہ تر دھرنے، گھراؤ اور جلوس اسپانسرڈ ہوتے ہیں۔ پیاس نے اُسے بے چین کیا تو وہ باہر نکلا۔ باہر واش بیسن کی ٹونٹی کھولی۔ 'شوں' کی ایک آواز کے ساتھ ہوا نکلی، لیکن پانی نہیں آیا۔ وہ باتھ روم میں گیا۔

ٹونٹی کھولی، پانی ندارد تھا۔ پیاس کی شدت نے مضطرب کر دیا تھا۔ بدحواسی میں باتھ روم کی ساری ٹونٹیاں کھولتا چلا گیا۔

’’پانی کہاں مر گیا؟‘‘

آس پاس کے کمرے کے دروازے کھٹکھٹانے لگا۔ دروازے دیر تک نہ کھلنے پر دیکھا دروازں پر تو تالے پڑے ہیں۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے، بے چینی، پہلے پریشانی اور اب خوف میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اندھیرا، گھپ اندھیرا .....ایسے میں پیاس نے اپنے تیور دکھانے شروع کر دیے تھے۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے سر کے بالوں کو نوچ رہا تھا۔ اس کے حلق سے صرف ’’پانی .... پانی.....‘‘ نکل رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے اُس نے ہاسٹل کی پوری راہداری طے کر لی تھی۔ متعدد دروازے کھٹکھٹا لیے تھے، کئی باتھ روم کی ٹونٹیاں کھنگھال لی تھیں۔ پانی کا قطرہ بھی میسر نہیں آیا۔ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اُس نے موبائل میں پھر وقت دیکھا۔ 4/بج رہے تھے۔ ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ بجلی اتنی طویل، کبھی نہیں جاتی تھی۔ کبھی چلی بھی جاتی تو یونیورسٹی کے دیو قامت جنریٹر فوراً چالو ہو جاتے تھے اور بجلی آناً فاناً اپنے بگڑے کاموں کو سدھار لیا کرتی تھی۔ اچانک یاد آیا کہ کچھ لڑکوں کے کمرے خالی نہ کرنے سے یونیورسٹی انتظامیہ نے کچھ سخت اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔ شاید رات میں بجلی اور پانی کی سپلائی کاٹ دی گئی ہو.....اب اس کی گھبراہٹ میں خوف در آیا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اگر اور تھوڑی دیر میں پانی نہ ملا تو شاید اس کی جان نہ چلی جائے۔ وہ کیا کرے اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا.....اس کے جسم کی طاقت، یوں نکلی جا رہی تھی گویا کسی نے غبارے میں سوراخ کر دیا ہو۔ ہاتھ، پاؤں میں دم نہیں تھا، حلق خشک ہو چکا تھا جیسے دور تک صحرا ہی صحرا ہو، سورج کی تپش بھی شدید ہو اور پانی کا کہیں نام نہ ہو.....آج اُسے پانی کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اُس نے کبھی اپنے کمرے میں پانی بھر کر نہیں رکھا۔ کبھی رات کو ضرورت پڑتی تو واٹر ٹیپ سے پی لیا۔ ایسا تو علم نہیں تھا کہ بات یہاں تک آ جائے گی.....یہ وائس چانسلر ہے یا یزید........بند ہوتی آنکھوں سے

ایک دھندلا، دھندلا منظر آہستہ آہستہ واضح ہوتا گیا۔

عراق کا شہر کربلا......شعلے اُگلتی گرمی، دور دور تک کہیں کوئی سایہ نہ ہمسایہ.....

پیاس کی شدتیں اپنی انتہا پر تھیں۔امام حسین کے جری ساتھی یکے بعد دیگرے جامِ شہادت سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔فرات پر یزید کے خونخوار درندوں کا سخت پہرہ تھا۔پانی کی ہر التجا کے بدلے تیروں کی انی حلق میں گھس کر پیاس کے احساس کو ہی ختم کر دیتی تھی۔امام حسین کے ساتھی جواں مردی سے مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما رہے تھے۔ خیموں کے اندر خواتین کے حلق پیاس کی شدت سے بند سے ہوئے جا رہے تھے۔زبان پر کانٹے اُگ آئے تھے۔ چھاتیوں کا دودھ بھی خشک ہو گیا تھا۔معصوم نونہالوں کی حالت نازک ہوتی جا رہی تھی۔ ہلکا ہلکا شور، پانی پانی کرتی زبانیں.....لیکن دشمنوں تک کوئی آواز نہ جاتی۔ خودداری، جاں نثاری اور سر نہ جھکانے کے جذبے نے بے جان جسموں میں بھی حرارت بھر دی تھی۔امام حسین خیمے میں داخل ہوئے۔زینب نے لپک کر بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔

''بھیا۔سب کچھ ختم ہو گیا۔''

''زینب حوصلہ رکھو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

''بھیا۔علی اصغر..... پیاس کی شدت سے بے چین ہوئے جاتے ہیں۔دشمنوں سے اس شیر خوار کے لیے پانی مانگ لو.....شاید وہ اسے دو بوند پانی دے دیں۔''

زینب نے اپنی گود سے علی اصغر کو امام حسین کے حوالے کر دیا۔امام حسین نے بچے کو گود میں لیتے ہوئے اُسے پیار کیا.....بچے کی زبان باہر کو آ رہی تھی.... پیاس کی شدت، خطرے کے نشان کو بھی پار کر رہی تھی۔ باپ کی شفقت ،بے بسی اور مجبوری آنسو بن کر آنکھوں سے باہر آئی۔لیکن آنسو بھی حسین کے چہرے سے داڑھی تک کا سفر ہی طے کر پائے۔تقدیر کو شاید یہی منظور تھا۔حسین بچے کو لیے ہوئے خیمے سے باہر آئے۔ باہر سورج آسمان پر قہر برپا رہا تھا۔نیچے زمین تپش کے مارے انگارہ بنی ہوئی تھی۔گرم ہوا کے تھپیڑے جسموں کو جھلسا رہے تھے۔ ریگزار میں بے گورو کفن ساتھیوں کے لاشے دور تک پھیلے

ہوئے تھے۔ سامنے عدو کا لشکر تھا۔ جو ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ انہیں فتح قریب نظر آرہی تھی کہ اب صرف فوج کا سپہ سالار باقی رہ گیا تھا۔

امام حسین نے دشمنوں سے مجبور و بے کس ہو کر کہا۔

''دیکھو۔ یہ چھ ماہ کا شیر خوار.......تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ اس بچارے کا کیا قصور۔ خدا کے لیے اسے پانی دے دو۔....'' زبان نے زیادہ ساتھ نہ دیا۔ حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ خود بھی بے حد پیاسے تھے۔ ہاتھوں میں لرزہ طاری تھا۔ بچے کی حالت نا قابل دید تھی۔ پورے جسم کی طاقت، زبان میں سمیٹتے ہوئے حسین دوبارہ گویا ہوئے۔

''تم سمجھتے ہو، بچے کے بہانے حسین پانی پی لے گا.....حرام ہے مجھ پر ایسا ایک قطرہ بھی.....لو میں بچے کو یہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ تم خود اسے پانی پلا دو۔''

کہتے ہوئے حسین نے تپتی ہوئی ریت پر علی اصغر کو لٹا دیا.......بچہ دھوپ اور ریت کی تپش سے تڑپنے لگا.....دشمنوں میں چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ کوئی اسے حسین کی کوئی چال سمجھ رہا تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ دشمن دشمن سب برابر ہیں، کیا بڑا، کیا بچہ.......اور پھر پانی پر پابندی لگا کر ہی تو ہم نے اپنی فتح کا منصوبہ بنایا تھا۔ بچے کو پانی پلانے سے ہماری منصوبہ بندی، ختم ہو جائے گی۔

بچے کی تڑپ اور ظالموں کے اٹل رویے کو دیکھتے ہوئے امام حسین نے دوڑ کر بچے کو اُٹھا لیا۔ گود میں لے کر پیار کرنے لگے۔

''بیٹے صبر کیجئے۔ صبر.....خدا کی یہی مرضی ہے۔''

باپ کے ان جملوں نے معصوم کے دل پر پھائے کا کام کیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لکیر نمودار ہوئی، اتنے میں وہ ہوا، جو شاید دنیا نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ آسمان لرز اٹھا اور زمین کانپ گئی۔ عدو نے ایسا تیر مارا کہ علی اصغر کے حلق کے پار ہوتا ہوا امام حسین کے بازوؤں میں پیوست ہو گیا۔ بچے نے جامِ شہادت سے اپنی پیاس ابدی طور پر بجھالی تھی۔

''نہیں.....نہیں......''

خوف اور دہشت کے مارے اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھیل گئے۔ پیاس کے لیے دنیا میں ایسا بھی ہوسکتا ہے....میری پیاس تو کچھ بھی نہیں'' اُسے حوصلہ ملا۔ اس کی نظروں میں علی اصغر کا سراپا گھومنے لگا۔ ایک شیر خوار، چھ ماہ کا معصوم........جسے کربلا کے سب سے کم عمر شہید ہونے کا اعزاز حاصل ہوا.....اُسے پیاس اور پانی کے رشتے کی اہمیت سمجھ میں آنے لگی۔ اچانک اس کے حلق کے کانٹے صحت مند ہونے لگے اور وہ پانی کے لیے چیخنے لگا۔

''پانی........پانی........''

موبائل پر گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ ہزاروں کلومیٹر دور فون اس کی ماں نے اُٹھایا۔ رات کے چار بج رہے تھے۔ ماں گھبرا گئی۔ اتنی رات کو بیٹے کا فون.....مضطرب ممتا نے دعا کی۔

''اللہ خیر!''

''ہاں بیٹا......کیا بات ہے؟''

''پا.....پا.....نی.....ام.....امّی.....پانی......''

اس کے حلق سے لفظ نہیں نکل پا رہے تھے۔ انہیں حلق کے اندر اُگ آنے والے کانٹوں کی مزاحمت کا سامنا تھا۔ ماں کی آواز پر وہ تڑپ اُٹھا....

''ہاں.....بیٹا....کیا ہوا......کیا ہوا میرے لعل....پانی.....''

''امّی.....مجھے.....پیاس لگی ہے....اور یہاں پانی نہیں ہے۔''

ماں تڑپ اُٹھی۔ اس کی نظروں میں اس کا لاڈلا گھوم گیا۔ پیاس کی شدت سے مضطرب بیٹے کی تصویر اس کی نگاہوں میں تیرنے لگی۔ بیٹے کی پیاس سے پریشان، خوف زدہ، ٹیلی فون کان پر لگائے کمرے میں ٹہلتی ہوئی ماں کو اچانک ایسا لگا گویا وہ بی بی ہاجرہ ہے اور لق و دق صحرا میں ننھا اسماعیل، پانی، پانی.....پکار رہا ہے....واقعی عرب کے دور تک

تپتے ریگستان میں ایک ننھا بچہ، اپنی ماں کی گود میں پانی کے لیے ترس رہا ہے۔ حضرت ہاجرہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ دور، دور نظر دوڑاتی ہیں۔ پانی تو پانی کہیں آثار بھی نظر نہیں آتے، بچے کو کبھی گود میں لیتی ہیں، سینے سے چمٹاتی ہیں۔ کبھی اس کے ہونٹوں کو چومتی ہیں۔ بچے کو زمین پر لٹا کر دوڑتی ہوئی ایک سمت کو جاتی ہیں۔ دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا ہے گویا، پانی بہہ رہا ہے۔ دوڑتی ہوئی پانی کی طرف جاتی ہیں۔ گرتی پڑتی جب وہاں پہنچتی ہیں تو چمکتی ہوئی گرم ریت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مایوسی کی گرفت مضبوط ہونے لگتی ہے۔ بیٹے کی پیاس کا خیال اچانک کوندتا ہے۔ مایوسی فرار ہو جاتی ہے۔ نظریں اُمید سے لبالب ہو جاتی ہیں۔ دور بہت دور، پانی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا پانی لہریں مار رہا ہو۔ اُمید نے جسم میں توانائی سرایت کی اور پیروں نے خود بخود دوڑنا شروع کر دیا۔ گرتے پڑتے وہاں پہنچتی ہیں جہاں پانی نظر آ رہا تھا۔ مگر یہ کیا، پانی تو غائب تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو دور پانی کی جھلک نظر آئی۔ وہ دوڑ پڑیں مگر پانی وہاں بھی نہیں تھا۔ سرابوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے وہ تھک چکی تھیں۔ حوصلے پست ہو گئے تھے۔ ہمت جواب دے گئی تھی۔ جسم چور چور تھا۔ قدموں کے چھالے، ہمت و حوصلوں کو شل کر چکے تھے۔ زمین پر دو زانو ہو کر اللہ سے دعا مانگتی ہیں:

"اے اللہ۔ میرے لال کو بچا لے۔ اس کی پیاس کا انتظام کر دے۔"

بچے کا خیال آتے ہی، بچے کی طرف چل پڑتی ہیں۔ پاس پہنچ کر دیکھتی ہیں۔ بچہ کھیل رہا ہے اور بچے کی ایڑی کے پاس سے چشمہ اُبل رہا ہے۔ انہیں یہ دیکھنے اور پتہ لگانے کا وقت تھا نہ فرصت کہ پانی کہاں سے آیا۔ فوراً چلو میں پانی بھر کر بیٹے کو پلاتی ہیں۔ بچے کو سکون ملتا ہے۔ ماں خود بھی پانی پیتی ہے اور بچے کو گود میں اُٹھا لیتی ہے۔ منہ آسمان کی طرف، گویا خدا کا شکر ادا کر رہی ہوں۔

"واللہ! کیسی پیاس تھی....؟ جسے بجھانے کو اللہ نے چشمہ ہی جاری کر دیا۔"

پریشان ماں کو تھوڑی دیر کے لیے راحت نصیب ہوئی۔ اچانک انہیں اپنے بیٹے کے فون کی

یاد آئی۔

''ہیلو بیٹا۔۔ہاں بیٹا.....کیا ہوا......؟''

دوسری طرف سے فون کٹ گیا تھا۔ بار بار ملانے پر بھی نہیں مل رہا تھا۔ سوئچ آف ہونے کا اشارہ مل رہا تھا۔شاید فون کا چارج ختم ہو گیا تھا۔

''ماں......ماں.......''اچانک فونDis Connectہو گیا۔

''ارے بیٹری کا چارج ختم ہو گیا ہے۔بجلی بھی نہیں ہے،اب کیا ہوگا۔'' پیاس کے مارے اس کی حالت نازک ہو گئی تھی۔ اس نے ساری قوت جمع کر کے بھاگنا شروع کیا۔وہ ہاسٹل سے باہر آیا۔باہر گارڈ سے پانی مانگا۔

''پانی تو ختم ہو گیا..''

وہ ہاسٹل سے باہر کی طرف بھاگنے لگا۔اندر ہی اندر وہ خدا سے دعا مانگنے لگا۔

''اے اللہ.. پانی..... پانی دلا دے.....تیرے خزانے میں کیا کمی ہے۔تو جب دینے پر آتا ہے تو پھر ہر کمی پوری ہو جاتی ہے۔تو تو اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔کبھی پانی پانی کر کے اور کبھی قطرے قطرے کو محتاج کر کے۔'' اس کی نظروں میں ایک ایک منظر زندہ ہونے لگے۔کبھی طوفان نوح میں آسمان سے برستا اور زمین سے اُبلتا پانی جس نے سوائے چند افراد اور حیوان کے سب کچھ غرقاب کر دیا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔کبھی دریائے نیل کا موسیٰ کو راستہ دینے کا منظر اور فرعون کو غرقاب کرنے کا واقعہ۔کبھی اُڑیسہ میں سونامی کی تباہی کا دردناک منظر نامہ،تو کبھی ترقی یافتہ ملک جاپان میں سونامی کے ذریعہ ایٹم بم کی تباہی کو یاد دلانے والا طوفان،کبھی اترا کھنڈ میں بادلوں کے پھٹنے اور کبھی کشمیر میں بھیانک سیلاب کے مناظر،کبھی گنگا اور جمنا کے بے قابو پانی سے ہونے والی تباہیوں کا منظر..... اس کی نظروں کے سامنے کبھی پیاس اور کبھی پانی...... یکے بعد دیگرے جھماکوں کی طرح آتے رہے۔پانی جو پیاس بجھاتا ہے۔لوگوں کے حلق،زمین کے گلے،درختوں کی جڑوں کو سیراب کرتا ہے۔ کیا پانی کو پیاس نہیں لگتی۔ پانی کبھی کبھی اپنی پیاس بھی بجھاتا ہے،ہزاروں افراد کو غرقاب

کر کے اور تباہی مچا کر پانی اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ سوچتے سوچتے وہ چونک گیا۔
''کیا آج میری پیاس نہیں بجھے گی........''

وہ بھاگتا رہا۔ صبح نے آنکھیں کھولنی شروع کر دی تھیں۔ شہر پر تنی رات، نیند اور خاموشی کی چادر جگہ جگہ سے پھٹنے لگی تھی.... مندروں میں بھجن کیرتن اور مسجد میں اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ اندھیرے اُجالے میں پنجہ کشی ہو رہی تھی۔ اُجالے کا پلّہ بھاری پڑ رہا تھا۔ وہ دوڑتا رہا۔ اس بھاگ دوڑ میں اس کے چپل کب کا اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اُس سے علم نہیں تھا۔ اُسے ایک چائے کی دوکان کھلی ہوئی نظر آئی۔

''پانی...... پانی ہے بھائی صاحب......''

''نہیں....نہیں.... بھاگ یہاں سے۔ یہاں چائے ملتی ہے پانی نہیں۔''

وہ پھر بھاگنے لگا...... اب وہ شہر کے باہر بہنے والی ندی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ کئی جگہ گرا، چوٹ لگی، اُٹھ کر پھر بھاگنے لگا۔ دور ندی دکھائی دے رہی تھی۔ گرتے پڑتے وہ ندی تک پہنچ گیا.... مگر یہ کیا ندی خشک تھی۔ پانی کا ایک قطرہ بھی ندی کے دامن میں نہیں تھا۔ وہ پھر بھی ندی کے اندر اُتر گیا۔ ریگ زاروں نے صبح کے وقت پیر کے تلوؤں میں ٹھنڈک پہنچائی، ایسا لگا گویا تلوؤں کے خلیوں کی پیاس کو کچھ راحت ملی ہو۔ یہ راحت اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر بھی نہیں تھی۔ وہ واپس قدموں لوٹا اور شہر کی طرف بھاگنے لگا۔ راستے میں بہتے ہوئے غلیظ، بدبودار، کالے پانی کے ایک نالے نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ اپنی پیاس بجھانے کو نالے میں اترنا ہی چاہتا تھا کہ نالے کے گندے پانی کی بدبو، ناک سے جیسے ہی اندر داخل ہوئی، اُسے زور کی اُبکائی آئی اور وہ پیاسا ہی واپس دوڑ لیا۔ دوڑتے دوڑتے وہ شہر کی شاہراہ پر آ گیا۔ اب دن کو سورج کا بھرپور ساتھ مل گیا تھا۔ دور شاہراہ کی دوسری جانب ایک پانی کا ٹینکر کھڑا تھا۔ اُس کی اُمیدوں کو پر لگ گئے۔ ''ٹینکر میں ضرور پانی ہوگا۔'' اس نے سوچا اُمید نے حوصلہ اور ہمت کو سہارا دیا۔

اس نے اپنے ناتواں جسم کے روئیں روئیں سے طاقت کے بچے کچے جراثیم جمع

کیے اور ٹینکر کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس کی نظریں ٹینکر پر تھیں۔ حلق میں پیاس کے کانٹے تھے، دوڑتے دوڑتے اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکلی جارہی تھی۔ ٹینکر سے کچھ قبل ہی اُسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا، بڑی مشکل سے اُٹھا، اس کے پیر، اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ کسی طرح گھسٹ گھسٹ کر وہ ٹینکر کے پاس پہنچا اور اس کے نل کے نیچے گر پڑا۔ ٹینکر سے اچانک پانی کا فوارہ جاری ہوا۔ پانی کی تیز دھار اس کو بھگو رہی تھی، اس کے جسم کو سیراب کر نے کی کوشش کررہی تھی، جب کہ اس کی پیاس نے اس کی روح کو پہلے ہی ابدی طور پر سیراب کردیا تھا۔

□□□

عیدگاہ سے واپسی

پریم چند کا ننھا حامد ستر سال کا بزرگ میاں حامد ہو گیا تھا۔ اسے اپنے بچپن کا ہر واقعہ یاد تھا۔ اُسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ بچپن میں عید کی نماز کے لیے گیا تھا تو واپسی میں تین پیسے کا چمٹا خرید کر لایا تھا۔ اُس وقت اس کے دوستوں نے اس کا مذاق اُڑایا تھا۔ لیکن اس کے دوستوں کے خریدے کھلونے یکے بعد دیگرے میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ اس کے چمٹے کی ایک ضرب نے سب کو بے کار کر دیا تھا۔ گھر آنے پر اس کی دادی پہلے اس سے ناراض ہوئی تھیں اور پھر اُسے گلے لگا کر خوب پیار کیا اور دعائیں دی تھیں۔ اس کے والدین کو بچپن ہی میں اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اُسے ان کی صورتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ بعد میں دادی نے اُسے غریبی، مجبوری، بے بسی اور لاچاری کے لقمے کھلا کھلا کر پالا تھا۔ اس کا بچپن دوسرے بچوں سے مختلف تھا۔ دونوں دادی پوتے ایک دوسرے کی کائنات تھے۔ اُسے وہ دن بھی یاد تھا جب قیامت صغریٰ نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ایک رات جب وہ سو رہا تھا۔ بہت تیز آندھی آئی تھی۔ ہوا اور پانی نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بہت سے پیڑ، پھوس کی چھتیں، کچی دیواریں اور جھونپڑے زمین سے اپنا رشتہ ختم کر چکے تھے۔ ایسے میں اس کی دادی جو گھر کے اسارے میں محو خواب تھیں، چھان گرنے سے دب کر اپنے بچوں کے پاس چلی گئی تھیں۔ وہ دادی دادی کرتا روتا رہ گیا تھا۔ گاؤں کے ہی لوگوں نے دفن وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔ وہ تقریباً پندرہ سال کا تھا۔ اس کا حال ایسا تھا گویا زندگی کی دوڑ میں تنہا رہ گیا ہو۔ اس کا اس بھری پری دنیا میں دادی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد پڑوس کے بابا سکھ دیو نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گئے اور اُسے اپنے بچے

کی طرح پالا پوسا۔ گاؤں کے اسکول سے پانچویں تک پڑھنے کے بعد اُس نے پاس کے ایک چینی مل میں مزدوری کا کام شروع کر دیا تھا۔

''بابا...... بابا..... مجھے بیلون لینو ہے''

اس کے آٹھ سالہ پوتے ساجد نے ایک غبارے والے کو دیکھ کر اسے ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا تو وہ ماضی کے صحرا میں چلتے چلتے اچانک رک گیا تھا، ماضی کے واقعات بھی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے اکلوتے پوتے کے ساتھ عیدگاہ جا رہا تھا۔ عیدیں تو ہر سال آتی رہتی ہیں اور ہر سال وہ عید کی نماز ادا کرتا تھا لیکن اس بار وہ اپنے پوتے کے ساتھ پہلی دفعہ عیدگاہ جا رہا تھا۔

''بیٹا ابھی نہیں، واپسی پر لِن گے۔ ابھی نماز کو جا رے ہیں۔''

اس کے گاؤں سے عیدگاہ تقریباً 5 کلومیٹر دور تھی۔ اس کا اپنا گاؤں ہندو اکثریتی گاؤں تھا وہاں مسجد نہیں تھی، پاس کے گاؤں میں مسجد تھی۔ اکثر مسلمان جمعہ اور عید۔ بقرعید کی نمازوں کے لیے وہیں چلے جاتے تھے۔ حامد کو عیدگاہ میں ہی عید کی نماز پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن کبھی موسم کی خرابی، کبھی وقت کی تنگی اور کبھی کام کی فراوانی کے باعث وہ ہر سال عید گاہ نہیں جا پاتا تھا۔ اس بار وہ کافی عرصے بعد عیدگاہ کے لیے اپنے پوتے ساجد کے ہمراہ نکلا تھا۔ گاؤں سے نماز کے لیے ایک ٹولہ روانہ ہوا۔ کچھ نوجوان اسکوٹر اور بائک سے نکلے تھے۔ کچھ پیدل ہی چل رہے تھے۔ کتنی خوشی اور رونق تھی ان کے چہروں پر۔ واقعی عید اللہ کا انعام ہے۔ ایک ماہ کے روزے رکھنے کے بعد، عید کی خوشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اللہ مسلمانوں کی محنت، صبر، لگن اور للّٰہیت کے بدلے عید کے دن ان کے گناہ بخش دیتا ہے۔ میاں حامد نے رمضان کے پورے روزے رکھے تھے۔ گھر میں اس کی بہو بھی روزے کی پابندی کرتی تھی۔ ایک پوتا اور ایک پوتی...... بس یہی کائنات تھی اس کی۔ بیٹا واحد ..... گذشتہ دنوں ہونے والے ہندو مسلم فساد کی نذر ہو گیا تھا۔ بیٹے کی یاد آتے ہی اچانک ذہن کے ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ چار سال قبل، پس منظر کا حصہ بن چکے مناظر، یکے بعد دیگرے نظروں

کے سامنے آنے لگے۔

ملک پر بڑا برا دن آیا تھا۔ سرخ آندھی اس بار شہروں سے اُٹھی تھی جو شہروں، شہروں قصبات اور دیہات میں پھیل گئی تھی۔ ہندو مسلم منافرت.....ایک دوسرے کے خون کے پیاسے لوگ......عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا جنون......کیا عبادت گاہوں کی مسماری سے کوئی قوم ختم ہو جاتی ہے؟ یہ وہی ہندو مسلم تھے جنہوں نے شانے سے شانہ ملا کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔ آج کیا ہو گیا ہے ان کو؟ کیوں ایک دوسرے کے قتل کے در پے ہیں۔ واحد بے چارہ ان حالات سے بے خبر تھا، اس نے تو گاؤں میں آنکھ کھولی تو اپنے بابا سکھ دیو، چاچا بلدیو اور اپنے ہم عمر دوست رام اور کنور پال کو دیکھا تھا۔ وہ تو انہیں کے درمیان کھیلتا ہوا بڑا ہوا تھا۔ پاس کے ہی شہر میں وہ ایک بیکری میں مزدوری کا کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ اور گاؤں کی محنت مزدوری سے میاں حامد کسی طرح گھر چلا رہے تھے۔ شہر میں آنے والی سرخ آندھی نے بڑی تباہیاں مچائی تھیں۔ واحد بھی اس سرخ آندھی کی زد میں آ گیا تھا۔ اسے اس کے ہی ساتھیوں نے سرخ آندھی میں جھونک دیا تھا۔ غضب تو اس وقت ہوا جب واحد کی لاش گاؤں پہنچی۔

" حامد......او حامد....واحد کی لاش....آئی ہے" بلدیو نے میاں حامد کو خبر دی تو اُسے جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بلدیو کو پکڑ کر چلایا۔

" کیوں مجاق کرو ہو۔"

ابھی وہ بلدیو کے کاندھوں کو پکڑ کر ہلا ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی دروازے پر رکی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور اسٹریچر پر واحد کی لاش لیے دو لوگ اندر داخل ہوئے۔ لاش کو چارپائی پر لٹا کر الٹے قدموں لوٹ گئے۔ کسی میں ان سے واحد کی موت کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ سارے گاؤں والوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ایک ایک کر کے سب کو پتہ چل گیا تھا کہ واحد کو شہر میں اس کے ساتھی مزدوروں نے مار دیا تھا۔ گاؤں کے ہندو، خود کو واحد کا قاتل محسوس کر رہے تھے۔ میاں حامد کی حالت عجیب تھی، ان پر سکتہ طاری

ہو گیا تھا۔ آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ لاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہے تھے۔ گویا انہیں امید ہو کہ واحد اب اٹھا اور تب اٹھا۔ اور اٹھتے ہی بابا کہتا ہوا ان سے لپٹ جائے گا۔ اچانک بہت زور سے چیختے ہوئے میاں حامد زمین پر بے سدھ گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ واحد کی بیوی شکیلہ پر بھی بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ساجد اور نازو اپنی ماں کے بے ہوش جسم سے لپٹے رو رہے تھے۔ بلدیو اور گاؤں کے پردھان ٹھاکر امر پال نے تدفین کا انتظام کیا۔ واحد کے جانے کے بعد سے میاں حامد کی حالت اس بوڑھے کی سی ہو گئی تھی جو لاغر ہو، کمر جھکی ہو اور اس کی لاٹھی اس سے چھین لی گئی ہو۔ میاں حامد نے بچپن سے ہی بڑے نازک حالات دیکھے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو کھانے کے لالے پڑ جاتے۔ مٹر، باجرہ، بے جھڑ اور جو کی روٹیاں بھی دن میں ایک وقت مل جاتیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے۔ گھر، گھر کیا تھا۔ بس ایک کمرہ اور اسارا تھا۔ کھیتی کی زمین نہیں تھی۔ اس کے باپ دادا نے بھی دوسروں کے یہاں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالا تھا اور ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ شروع میں بابا سکھ دیو کے گھر سے ہی اسے وقت بے وقت کھانا ملتا تھا بعد میں اس نے خود بھی کھانا بنانا شروع کر دیا تھا۔

''بابا......او بابا.....وہ تتلی پکڑ دو نا..........کتی اچھی ہے وہ''

ساجد کی آواز نے ایک بار پھر انہیں سوچ نگر کی گلیوں سے حقیقت آباد کے کچے راستوں پر لا دیا تھا۔ اس کا پوتا ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ تتلی کبھی ادھر کبھی ادھر جاتی، لیکن ساجد کے پہنچتے ہی اڑ جاتی۔ انہیں ایک پل کو لگا جیسے تتلی ان کی خوشی ہو، جو ہمیشہ اس سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔ لمحہ بھر کو لگتا کہ اب ہاتھ آئی.....اب آئی۔ لیکن پھر پھُر سے اڑ جاتی۔ بے چارے ساجد کو کیا پتہ کہ یہ تتلی ہماری قسمت میں نہیں؟ ہماری قسمت میں تو ہمیشہ کے دکھ ہیں جو سردی کی راتوں جیسے طویل ہوتے ہیں۔

''ساجد بیٹے۔ نا۔ تتلی کے پیچھے نا بھاگو۔ گر پڑو گے۔ کپڑے کھراب ہو جاون گے۔''

کپڑے، کپڑے تو ساجد نے پہنے تھے مگر نئے نہیں تھے۔ جبکہ ساجد نے پچھلے ہفتے ضد کی تھی۔

''بابا مجھے بھی نئے کپڑے سلواؤ نا، میں بھی حشمت کی طرح نئے کپڑوں میں عیدگاہ جاؤں گا۔''

''اچھا بیٹا... لادن گے۔'' بوڑھے حامد میاں نے مجبوراً کہا۔

اورانہوں نے ساجد کو پرانے کپڑوں کے ڈھیر میں سے ٹھیک ٹھاک سے کپڑے لادیے تھے۔ اتفاق سے چینی مل کے باہر پرانے سستے کپڑوں کا ایک ٹھیلہ عید کے سبب لگا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی شرٹ اور نیلی پینٹ لے جا کر بہو کو دیے۔

ساجد کو ماں اور دادا نے بہکا لیا تھا۔ چھوٹی نازو کی طبیعت خراب تھی اسے ماتا نکل آئی تھی۔ وہ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی۔ مکھیاں اسے پریشان کرتیں۔ حامد مکھیوں کو دیکھ کر کئی بار سوچتا۔ ''اللہ نے مکھیاں کیوں پیدا کی ہیں۔ یہ تو سب کو پریشان ہی کرتی ہیں۔'' پر پھر خود ہی دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگتا کہ اللہ نے ہر چیز سوچ سمجھ کر ہی پیدا کی ہے۔

عید سے دو دن پہلے گاؤں کے حاجی لطیف ان کے پاس آئے تھے اور زکوۃ کے پانچ سو روپے دے گئے تھے۔ انہوں نے کچھ پیسوں سے گھر کی ضروریات کو پورا کیا تھا۔ ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ نازو کی بیماری اور گھر کے خرچے میں لگ جاتا تھا۔ عید کے لیے پیسے کہاں سے آتے۔ زکوۃ کے پیسوں سے انہیں کچھ راحت ملی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اب کی عید پر وہ ساجد کو ریموٹ سے چلنے والی کار اور نازو کو پلک جھپکنے والی گڑیا خرید کر لائیں گے۔ بہو جو جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھی، کے لیے ایک سوٹ لائیں گے۔ عیدگاہ جانے سے پہلے انہوں نے نہا کر اپنے پرانے دھلے کپڑے پہنے۔ پھر ساجد کو تیار کیا۔ ساجد کی ماں اسے عیدگاہ بھیجنے کو تیار نہ تھی۔ لیکن ساجد کی ضد اور میاں حامد کی مرضی کے آگے وہ مجبور ہوگئی تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اسے تو ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا کہیں اس کے بیٹے کو کچھ نہ ہو جائے۔ گاؤں

کے لوگ ساجد کو بہت پیار کرتے تھے، وہ تھا ہی بہت پیارا۔عید گاہ چلنے سے پہلے انہوں نے سویاں کھائیں۔ پھر ایک ایک روپیہ سب کو عیدی کے دیے۔انہوں نے بلدیو کے بچوں کو بھی عیدی دی تھی۔وہ ہر سال ان کے بچوں کو عیدی دیا کرتے تھے۔ساجد نے اپنے اور نازو کے روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔گاؤں کے دس بارہ بڑے بوڑھوں، بچوں پر مشتمل یہ ٹولہ سفید کرتا پائجامے میں ملبوس سر پر ٹوپیاں لگائے عید گاہ کے لیے نکلا تھا۔عید گاہ تک جانے کے لیے تین گاؤں کو پار کرنا پڑتا تھا۔سردیوں کا زمانہ تھا۔راستے کے دونوں جانب ہری فصلیں لہلہا رہی تھیں۔گیہوں کے کھیتوں پر شباب تھا۔دور دور تک ہرے بھرے گیہوں کے کھیت نظروں کو فرحت بخش رہے تھے۔سرسوں پھول رہی تھی۔ہرے اور پیلے رنگ نے زمین کو اس کنواری دوشیزہ سا بنا دیا تھا جس نے سبز رنگ کے کپڑوں پر پیلا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہو، اور قدرت زمین کے ہاتھ پیلے کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔بٹیا کے دونوں جانب فصلوں کی مہک دیوانہ بنا رہی تھی۔کہیں مٹر کے سفید اور جامنی پھول، کہیں اکھ کے کھیت۔گاؤں میں ایک آدھ کولھو بھی نظر آ جاتا۔کولھو سے گڑ کی بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔ویسے اب زیادہ تر کسان شوگر ملوں میں ہی گنا ڈالتے تھے اور نقد روپے لے آتے۔اب گاؤں میں بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔گاؤں کی نئی نسل کے بچے جب سے پڑھ لکھ گئے تھے اور کچھ نے باہر سروس شروع کر دی تھی گاؤں کا ماحول تبدیل ہونے لگا تھا۔اب وہ پہلے جیسی بے لوث محبت نہیں رہی تھی۔پہلے گاؤں کے کسی ایک شخص کا داماد سارے گاؤں کا داماد ہوتا تھا۔اس کی اتنی خاطر کی جاتی کہ وہ خاطر مدارات میں ڈوب جاتا۔ہندو مسلم شیر و شکر کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہونا، ایک دوسرے کے کام کروانا۔ چھان اٹھوانا، اکھ بُوانا، شادی بیاہ میں ہاتھ بٹانا ان کا معمول تھا۔

''میاں حامد.....میاں.....تنک ستائے لیو.....رس پیو۔گرم گڑ کھالیو۔''

مُراد پور گاؤں کے کولھو والے بزرگ چاچا ایشور نے عید گاہ جاتے قافلے کو روک لیا تھا۔مُراد پور کے گاؤں کے مسلم بھی عید گاہ جانے کو تیار تھے۔جلدی جلدی قافلے کی خاطر

کی گئی۔ قافلہ پھر آگے بڑھ گیا۔ حامد کو اطمینان ہوا کہ چلو ابھی بڑے بوڑھوں میں کم از کم اتنی محبت اور خلوص تو باقی ہے۔ قافلہ اب پکی سڑک پر آ گیا تھا۔

میاں حامد نے اپنے پوتے ساجد کو کندھے پر بٹھا لیا تھا۔ قافلہ پکی سڑک کی ایک جانب قطار بنا کر چل رہا تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار بس قافلے کے نزدیک سے گذری۔ سب لوگ جلدی سے ایک طرف کو نہ ہو گئے ہوتے تو معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔

''ابے اے کٹو ؤ! کاں جارئے او.........؟''

موٹر سائیکل پر سوار تین کم عمر اوباش قسم کے نوجوان، زور سے چلاّتے ہوئے برق رفتاری سے گذر گئے۔ ننھا ساجد چونک گیا۔

''بابا یہ کا بول رئے تھے.....؟''

''کچھ نا بیٹا.......یہ گندے بچے تھے.........''

میاں حامد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ زمانہ کتنا بدل گیا تھا۔ بڑے چھوٹوں کا امتیاز ہی نہ رہا۔ بیٹے، باپ کے سامنے بیٹھتے بھی نہیں تھے۔ میاں بیوی کسی کی موجودگی میں ساتھ بیٹھنے سے بھی کتراتے تھے۔ بہو، ساس سسر کا احترام کرتی تھی۔ آج سب الٹ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب فلموں اور فیشن سے ہوا تھا۔ بچوں میں فلموں کا شوق دن بہ دن بڑھ رہا ہے۔ وہیں سے خرافات سیکھتے ہیں۔ فیشن اللہ توبہ! لڑکیاں بھی پتلون پہننے لگی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بازو کی قمیضیں۔ دوپٹا یا تو گلے میں پٹے کی صورت یا پھر ندارد۔ گاؤں بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ کچے مکانوں کی جگہ پختہ اور بڑے مکان، موٹر سائیکلیں اور کاریں اب اکثر دکھائی دیتیں۔ پہلے کسی کے گھر کار ہوتی تو اسے بڑا رئیس مانا جاتا، لوگ اس کی مثالیں دیتے تھے۔ گاؤں کو شاہراہوں سے ملانے والی کچی سڑکیں کھڑنجے اور تارکول کی بننے لگی تھیں۔ علاقے میں فیکٹریاں اور مل لگنے لگے تھے۔ ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔

''بابا عید گاہ کب آوے گی.....؟''

''بس بیٹا.... وہ جو گام دکھر رہے نا.... بس وائی گام میں ہے....''

''بھئی جرا جلدی چلو.... کہیں ایسا نہ ہو، نماز ہی چھوٹ جائے۔ رمجان کی ساری محنت ہی مٹی میں مل جاوے گی۔''

میاں حامد نے قافلے کے بڑے، چھوٹوں، سب کو نصیحت کی۔ اور سب جلدی جلدی قدم بڑھانے لگے۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسلام پور کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ اسلام پور مسلم اکثریتی گاؤں تھا۔ عید گاہ کے راستے پر دونوں طرف میلہ لگا تھا۔ ساجد تو بے چین ہوا جا رہا تھا۔ کہیں جھولے والے آواز لگا رہے تھے۔ کہیں غبارے دھاگوں سے بندھے آسمان کی سیر کو رسی تڑا رہے تھے۔ گول گپے والے، چاٹ پکوڑی والے، دہی بڑے، بتاشے والے، مکا کی کھیلوں والے، آئس کریم والے، کھلونوں کی تو بہت سی دکانیں تھیں، کسی دکان پر ہر مال پانچ روپے، کسی پر ہر مال دس روپے کا بورڈ لگا تھا۔ ساجد کی نظریں چاروں طرف بکھری بازار کی رونق کو دیکھ کر ہونق ہوئی جا رہی تھیں وہ سب کچھ خرید لینا چاہتا تھا۔

''بھیا آجاؤ۔ جلدی آؤ.... نماج کھڑی ہون والی ہے۔''

عید گاہ سے لوگ راستے میں آنے والوں کو پکار رہے تھے۔

قافلے نے لپک کر عید گاہ میں قدم رکھا۔ عید گاہ بہت بڑی نہیں تھی۔ مغرب کی طرف مسجد جیسی عمارت کی تقریباً بیس فٹ اونچی دیوار تھی جس میں کنگورے کٹے ہوئے تھے دیوار کے آخری سروں پر دو بلند مینار تھے۔ باقی دور تک خالی زمین جو سال میں دو نمازوں کے لیے اپنا دامن پھیلائے رہتی تھی۔ عید میں بہت بھیڑ ہوتی تھی۔ اسلام پور کے علاوہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی یہیں نماز پڑھنے آتے تھے۔ میاں حامد بچپن سے اب تک نجانے کتنی بار عید گاہ آئے تھے۔ نماز کے بعد لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے تو ایسا لگتا گویا فرشتے زمین پر اتر آئے ہوں۔ نماز کے بعد اسلام پور کے لوگ آس پاس کے لوگوں کو بغیر کچھ کھائے پیئے واپس جانے نہ دیتے میاں حامد کے ساتھ کئی بار بلدیو چاچا کے بچے بھی آجاتے تھے۔ مسلمان نماز پڑھتے اور وہ سب کے جوتے چپلوں کی رکھوالی کرتے بعد میں

عید گاہ میلے سے میاں حامد ان کے لیے کچھ نہ کچھ تحفے ضرور خرید تے۔ وہ سب اپنے بھائی ہی تو تھے۔ وہ سب میاں حامد سے چھوٹے تھے۔ میاں حامد کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک بار بلدیو چاچا نے اپنی ٹریکٹر ٹرالی نکالی تھی اور گاؤں کے سارے مسلمانوں کو بھر کر عید گاہ لائے تھے۔ کتنا میل ملاپ تھا لوگوں میں۔ گاؤں میں امن و امان تھا۔ گاؤں کے حالات سیاست سے بدلے تھے۔ اب گاؤں میں بھی سیاست بڑھنے لگی تھی، پردھان اور گاؤں کے امیر لوگ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے۔ رات کو موٹر چوری کرواتے، صبح کو ہمدردی جتانے پہنچ جاتے۔ اور دو ایک دن بعد موٹر کہیں سے برآمد ہو جاتی۔ اسی طرح بیل اور بھینس بھی غائب ہو جاتیں۔ انہیں اچانک دس سال قبل کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس نے ایک رات بابا سکھ دیو کی بھینس چراتے مکھیا کے بڑے لڑکے کو دیکھ لیا تھا۔

''چور...... چور...... دیکھو بھینس چرا روئے ہے۔ چاچا...او بابا.....''

اس کی آواز پر بھینس کو بیچ میں چھوڑ کر چور فرار ہو گئے تھے۔ مگر اس نے ایک چور کو پہچان لیا تھا۔ اور غضب تو اس وقت ہو گیا جب اگلے دن پنچایت میں اس نے مکھیا کے بیٹے کا نام سب کے سامنے کہہ دیا۔ مکھیا کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

''تم جھوٹ بولت ہو.....میرا او بیٹو نہیں کوئی اور ہو گا.....''

''نہیں....نہیں.....میں نے اپنی آنکھن سو بیر پال کو دیکھو ہے.....''

''پنچو! یو مسلمان ہے..... یا مارے یو ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنو چاوے ہے۔.....''

میاں حامد نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ بات اس کے کردار پر آ جائے گی۔ نفرت کیا ہوتی ہے، اسے پتہ ہی نہ تھا۔ اس نے تو کبھی کسی کو بری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ کیا ہندو، کیا مسلمان۔ وہ تو بچپن سے ہی بابا سکھ دیو کے گھر رہ کر بڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ہی اس کی شادی کروائی تھی۔ گاؤں کے کئی مسلمانوں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ سکھ دیو کے گھر نہ رہے لیکن اس نے کسی کی نہ سنی تھی۔ پھر بابا اسے بیٹا ہی تو مانتے تھے۔ ہمیشہ اس کے دکھ سکھ میں شریک رہتے۔ مکھیا کے جملے نے تو جیسے میاں حامد کے سینے کو گرم سلاخوں سے داغ دیا

تھا۔اس کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ گم سم ہو گیا۔ مانوں اس کی زبان کاٹ دی گئی ہو۔لیکن اگلے ہی لمحے سکھ دیو اور ان کے خاندان والوں نے مکھیا اور اس کے بیٹے پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دی تھیں ۔ دونوں طرف سے زوردار حملے ہو رہے تھے۔اس سے قبل کے کچھ انرتھ ہو جاتا، حامد میاں نے ایک زور کی چیخ ماری.....

''بند کرو کھدا کے لیے.....!''

اور واقعی لڑائی کو اچانک بریک لگ گئے تھے۔

''تم لوگ میرے اوپر لڑ رئے ہونا۔ چلو میں گاؤں چھوڑ کر ہی چلو جاتا ہوں۔''

میاں حامد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، انہوں نے اپنا منھ دونوں ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا۔ان کے اتنا کہتے ہی مکھیا اور بلدیو چاچا ایک ساتھ ان کی اور لپکے تھے۔

''نہیں حامد......تم گام نا چھوڑو گے....''

اور پھر وہ ہوا جو گاؤں والوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔مکھیا نے اپنے بیٹے بیر پال کو سب کے سامنے مارنا شروع کر دیا۔

''یا کے کارن ہی سب کچھ ہوا ہے.......''

بڑی مشکل معاملہ رفع دفع ہوا تھا۔گاؤں میں حامد کی الگ پہچان تھی۔وہ ایک ایماندار مسلمان تھا۔جو جتنا مسلمانوں کا ہمدرد تھا اتنا ہی ہندوؤں کا بھی۔

''اللہ اکبر....''

امام صاحب نے نیت باندھ لی تھی سب نے دو رکعت نماز ادا کی۔خطبہ سنا اور دعا مانگنے لگے۔میاں حامد نے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے۔ان کے لب تھرتھرا رہے تھے، ہاتھ بھی لرزنے لگے۔''اے کھدا.....میرے کھدا.....ہم تو بڑے گنہہ گار ہیں۔موئے انسانوں کی کھدمت میں لگا دے۔یو جو ایک عجیب سے آندھی شہروں سے گاؤں کی اور چلی آوے ہے ہمیں یا سو بچا لئے......''

دعا کے بعد سب ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔میاں حامد جھک کر اپنے

پوتے ساجد سے گلے ملے۔ گلے ملتے وقت انہیں بے پناہ طمانیت اور مسرت کا احساس ہوا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ساجد کے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ ایک چھوٹا بچہ بن گئے ہیں بچہ جو معصوم ہوتا ہے جو فرشتہ صفت ہوتا ہے۔

''بابا.... بابا.....آؤ نا کھلونا لیں گے.....''

ساجد نے ان کا ہاتھ کھینچا تو وہ دکانوں کی طرف چل دیے۔ ساجد نے بہت سے کھلونے دیکھے۔ سب کو فیل کرتا گیا۔ آخر میں اسے اسے ریموٹ سے آگے پیچھے ہونے والی ایک خوبصورت سی کار پسند آگئی۔ ساجد نے ضد کر لی۔

''بابا میں تو یہ ہی لوں گا۔''

''بھیا کتنے کی ہے.....؟

''بابا پورے سو روپے کی''

''سو روپے.....؟'' میاں حامد کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی جیب میں کل دو سو روپے رکھے تھے۔ اگر وہ کھلونا خرید لیتے تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ لیکن وہ پوتے کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار ساجد کی ضد جیت گئی۔ مول بھاؤ کے بعد سودا پچاس روپے میں ہو گیا۔ پھر دونوں نے نازو کے لیے ایک آنکھیں مٹکاتی گڑیا خریدی، بابا سکھ دیو کے بچوں کے لیے بھی کھلونے اور دوسرا سامان خریدا۔ سامان لے کر وہ نکل ہی رہے تھے کہ اچانک گولیوں کے دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ دراصل اس بار عید اور کانوڑ یاترا آس پاس ہی تھے۔ سارے علاقے میں دہشت تھی۔ ہر طرف زعفرانی رنگ لہرا رہا تھا۔ پتہ چلا کہ کانوڑیوں کا ایک جتھا اسلام پور سے گذر رہا تھا۔ ان پر کسی نوجوان نے پتھر مار دیا تھا بس کیا تھا۔ کانوڑیوں نے عیدگاہ سے لوٹتے مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ خبر پھیلتے ہی گاؤں کے مسلمانوں نے گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ کانوڑیوں کی حمایت میں بھی بندوقیں گولیاں اگلنے لگی تھیں۔ گولیوں کا نشانہ بن کر کئی لوگ لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔

میاں حامد نے ساجد کو گود میں اٹھا لیا اور ایک طرف کو بھاگنا شروع کر دیا۔ انہوں نے قافلے کے دوسرے لوگوں کو ادھر ادھر دیکھا بھی، لیکن وہ ایک لمحہ بھی انتظار میں گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ گاؤں کے حاجی شوکت نے حامد میاں کو اسلام پور میں ہی رکنے کو کہا۔ اسلام پور مسلمانوں کا بڑا گاؤں تھا۔ مگر حامد میاں نے منع کر دیا اور ایک طرف بھاگنے لگے۔ وہ بہت تیز دوڑ رہے تھے۔ ساجد کے ہاتھوں میں کار، گڑیا اور دوسرا سامان تھا۔ ننھے ساجد کو پتہ نہیں تھا۔ اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میاں حامد پکی سڑک تک آ گئے تھے۔ ان کے بوڑھے قدموں میں نجانے کہاں سے طاقت آ گئی تھی۔ دراصل موت کا ڈر۔ خود ایک زبردست طاقت عطا کرتا ہے اور انسان وہ کر گذرتا ہے جس کا اُسے گمان تک نہیں ہوتا۔ ان کو ڈر تھا کہ اسلام پور کا معاملہ جب دوسرے گاؤں پہنچے گا تو پورے علاقے میں زہر پھیل جائے گا۔ وہ اس لمحے کے آنے سے قبل ہی اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ سڑک پر پیچھے سے شور کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا ایک بھیڑ بے تحاشہ بھاگی آ رہی تھی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں تلواریں، لاٹھیاں اور بلّم تھے۔ انہوں نے سڑک سے کھیتوں میں بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ اب بس ایک گاؤں پار کرنا رہ گیا تھا، جس کے پار ان کا گاؤں تھا۔ دوڑتے دوڑتے وہ تھک گئے تھے۔ گاؤں کے ایک ویران پڑے ٹیوب ویل کے پاس وہ سانس لینے کو رکے۔ انہوں نے راستے سے خود کو چھپا لیا تھا تاکہ کوئی گذرے، تو دیکھ نہ پائے۔

''بابا... کیا ہوا۔ آپ کیوں بھاگ رہے ہو.....؟''

''چپ.....پ...''

میاں حامد نے پوتے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہیں کوئی آواز نہ سن لے۔ اتنے میں گاؤں میں زبردست دھماکہ ہوا۔ لگا جیسے کہیں کوئی بم پھٹا ہو۔ اسلام پور سے اٹھنے والی آندھی سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ موقع ملتے ہی چنگاری، شعلہ بن رہی تھی۔ آگ گاؤں گاؤں پھیلتی جا رہی تھی۔ میاں حامد کے جسم میں خوف کا ناگ بری طرح لہرایا تھا۔ انہوں نے ایک

بار پھر اپنا راستہ تبدیل کیا۔اب وہ گاؤں سے نہ گذر کر کھیتوں کھیتوں اپنے گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے۔دوڑتے دوڑتے وہ اپنے گاؤں کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ساجد کو نیچے اتار کرانہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا پرانہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنے گاؤں میں آ گئے ہیں وہ گاؤں جہاں ان کی اور ان کے باپ دادا کی عمریں گذری تھیں۔وہ اطمینان سے ساجد کی انگلی پکڑے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ابھی وہ گاؤں میں داخل ہی ہوئے تھے کہ گاؤں سے ایک شور بلند ہوا۔

''مارو......پکڑو......''

اس سے قبل کے میاں حامد کچھ سمجھ پاتے ایک جتھا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ خون کی پیاسی تلواریں، قتل و غارت کا جنون اور دہشت پیدا کرنے والی آوازیں۔انہوں نے پلک جھپکتے ہی ساجد کو اپنی گود میں اٹھالیا اور جیسے ہی ایک طرف کو بھاگنا چاہا مکھیا کے بیٹے بیر پال کی دونالی سے نکلنے والی ایک بے رحم گولی نے ساجد کو نشانہ بنالیا۔

ساجد کے جسم کو پار کرتی ہوئی گولی میاں حامد کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ گولی نے اس طرح معصوم ساجد کا جسم پار کر کے میاں حامد کو زمین کا پیوند بنا دیا تھا جیسے حرملہ کا تیر معصوم علی اصغر کے حلق سے ہوتا ہوا امام حسین کے بازو میں ترازو ہو گیا تھا۔دونوں زمین پر آ رہے۔خون کا فوارہ دونوں جسموں سے بلند ہو رہا تھا۔زمین ساکت تھی۔آسمان خاموش تھا۔ہوا سانس لینا بھول گئی تھی۔دونوں کے خون میں لت پت لاشے پڑے تھے اور تھوڑی ہی دوری پر ساجد کی کار، تازو کی گڑیا، بہو کا سوٹ، ایک دھوتی اور ایک چھوٹی سی پیتل کی لٹیا پڑی تھی، جو میاں حامد بابا سکھ دیو کے گھر والوں کے لیے لائے تھے۔

□□□

تیری سادگی کے پیچھے (۱)

ثانیہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنی سہیلی ثمرین سے لپٹ گئی۔

''ارے....ارے....کیا ہو گیا....؟'' ثمرین نے ثانیہ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آج تو غضب ہو گیا......میری تو جیسے قسمت ہی جاگ اٹھی....'' ثانیہ نے بے تحاشہ ثمرین کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ ثمرین اس بے موسم برسات سے گھبراتے ہوئے بولی۔

''یار کچھ بتائے گی بھی یا.......؟''

''ارے آج میں ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اچانک ایک چینل پر میرے آئیڈیل معروف فکشن نگار حشمت ضیار، کا انٹرویو آ رہا تھا'' ثانیہ کے چہرے پر خوشی کے رنگوں کا آنا جانا، اُسے حسین بنا رہا تھا۔

''دھت تیرے کی.....یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں سمجھی تو نے ٹاپ کیا ہے۔'' ثمرین کے لہجے کا جوش ختم ہو چکا تھا، جیسے آگ پر پانی کے چھینٹے مار دیے گئے ہوں۔

''تجھے پتہ ہے حشمت ضیار، کی عمر کیا ہے؟ وہ ساٹھ کے آس پاس ہیں۔ ان کی شہرت کے سبب ہزاروں فین ہیں ان کے۔ تو کوئی روگ نہ پال لینا۔'' ثمرین نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے وہ بات نہیں ہے، جو تو سمجھ رہی ہے۔ مجھے کوئی پیار ویار نہیں ہوا ہے۔ میں تو ان کا بے حد احترام کرتی ہوں۔ تجھے پتہ ہے مجھے ان کا انداز پسند ہے۔ کیا زبان لکھتے

ہیں۔ ابھی گذشتہ دنوں ’آج کل‘ میں ان کی کہانی ’’رشتوں کا کھوکھلا پن‘‘ شائع ہوئی تھی۔ کیا کہانی تھی یار..... کتنی فنی مہارت سے کہانی کے تانے بانے بُنے تھے، لگتا تھا بیا چڑیا نے تنکوں کو آڑا ترچھا پرو کر خوبصورت سا گھونسلہ بنایا ہو۔ کہانی پڑھتے جاؤ اور واقعات کے پیچ وخم میں گرفتار ہوتے جاؤ۔ آج کل کے ماحول پر کتنی عمدہ کہانی تھی۔ آج ہر طرف لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کیا باہر کیا گھر، عزیز، قرابت دار، خون کے رشتے تک اب اعتبار کے لائق نہیں رہے۔ حشمت ضیار نے سگے ماموں کے ذریعے بھانجی کو ہوس کا نشانہ بنانے کی کہانی کو اس قدر فن کاری اور عمدہ زبان کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ قاری سحر زدہ ہو جاتا ہے۔ میں تو لرز اٹھی تھی۔ مجھے ایسے رشتہ داروں کی شکل میں موجود درندوں سے نفرت ہو گئی ہے۔‘‘

’’ہاں...... ہاں...... اب بس کر..... مجھے پتہ ہے ان کی یہ کہانی بہت مقبول ہوئی تھی۔ دراصل جو بھی سماج کی صحیح عکاسی کرتا ہے، اسے سب پسند کرتے ہیں۔ تو کچھ زیادہ ہی ایکسا ئیٹڈ ہو رہی ہے۔‘‘

’’ثمرین.... میں تو حشمت ضیار کو اپنا آئیڈیل مانتی ہوں۔ مجھے بھی کہانی کار بننا ہے۔ میں بھی سماج کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑوں گی اور ایسا درد آگیں نغمہ الاپوں گی کہ میری کہانی ہر کسی کی کہانی ہوگی۔ لڑکیوں پر ہو رہے ظلم و ستم کے خلاف مجھے آواز بلند کرنی ہے۔ مجھے مظلوم خواتین کا سہارا بننا ہے۔ حد ہو گئی ہے۔ جدھر دیکھو.... عورتوں اور لڑکیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ دہلی کی میڈیکل کی طالبہ کے ساتھ کیا ہوا؟‘‘ ثانیہ کے چہرے پر جوش، غصہ اور نفرت کے رنگوں کی آمیزش تھی۔

....

ثانیہ اور ثمرین دو سہیلیاں تھیں۔ دونوں بیٹ یک فرسٹ ائر کی طالبہ تھیں۔ ثانیہ جذباتی قسم کی لڑکی تھی۔ وہ عام زندگی گذارنے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو دوسروں سے الگ رکھتی تھی۔ آج کے نوجوانوں کی طرح فلمی ہیرو ہیروئین یا کرکٹ اسٹارز کو اپنا آئیڈیل بنانے کے بجائے اس نے ادیب و فن کار کو اپنا آئیڈیل بنایا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ

سماج میں تبدیلی، سوچ بدلنے سے آسکتی ہے اور سوچ کو قلم سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ایک ادیب یا مصنف بڑی آہستگی سے وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو بڑے بڑے طاقت ور لوگ نہیں کہہ پاتے۔ ثمرین سیدھی سادی زندگی گذارنے والی عام سی لڑکی تھی لیکن وہ بلا کی ذہین تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم کے زمانے میں صرف تعلیم کے حصول پر توجہ صرف کرنی چاہیے، باقی باتیں بعد میں۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک ساتھ ہی ہاسٹل میں رہا کرتی تھیں۔ ثمرین، ثانیہ کی ادب نوازی کے بارے میں جانتی تھی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ ثانیہ حشمت ضیار کی بہت بڑی فین ہے۔ ان کے افسانے اور ناول ثانیہ شوق سے پڑھتی تھی۔ یہی نہیں ان کے افسانوی مجموعے اور ناول خرید کر اپنے کمرے میں سجا رکھے تھے۔ اخبارات سے تراش تراش کر حشمت ضیار کی تصاویر جمع کر کے اس نے اچھا خاصا البم بنا رکھا تھا۔

''ثمرین.....ثمرین........اٹھ...نا یار.....ثانیہ نے ثمرین کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''اونہہ....سونے دے......'' ثمرین نے چادر کو اوپر تک کھینچتے ہوئے نیند میں کہا۔

ثمرین 9/ بجنے والے ہیں۔ دس بجے کلاس ہے....اور مجھے ایک خوش خبری بھی سنانی ہے۔''

ثانیہ نے ثمرین کی چادر چھینتے ہوئے اُسے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

''اچھا بابا....'' ثمرین بیڈ سے نیچے کودی۔ سلیپر ڈالتے ہوئے سیدھے باتھ روم گھس گئی۔ جلدی جلدی فارغ ہو کر منہ پر چھینٹے مارتے ہوئے باہر آئی۔

''اب کیا ہو گیا...؟'' کیا حشمت ضیار آنے والے ہیں؟'' ثمرین نے ثانیہ کے جذبات کو مذاق کی ترازو پر رکھ دیا۔

''حشمت ضیار آج تو نہیں آنے والے، مگر تو دیکھنا ایک دن میری ان سے ملاقات ضرور ہوگی....''

''اچھا...اچھا...،اب بتا کیا ہوا؟''

''ارے آج میری فیس بک پر ان سے چیٹنگ ہوئی۔ بڑا مزہ آیا۔ میں نے ان کا موبائل نمبر بھی لے لیا۔''ہرّا'' ثانیہ نے مستی میں ثمرین کو گود میں اٹھالیا اور ایک چکر لگا دیا۔

''ارے بابا.....میں گر پڑوں گی.....اتار مجھے......'' ثانیہ نے ثمرین کو تو اتار دیا لیکن خود مستی میں رقص میں محو ہوگئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گو جنگل میں پہلی بارش ہوئی ہے اور سارے چرند پرند مستی میں شرابور جھوم رہے ہیں۔

''چل بس، لا نمبر.....ان سے بات کریں گے...''

''نہیں بابا.....میں ان سے فون پر بات نہیں کر پاؤں گی تو ثانیہ بن کر بات کرنا.....''

''میں ...نہیں نہیں.....مجھے تو اس سے دور ہی رکھ....''

''ہیلو.......'' ثمرین کی کانپتی ہوئی آواز ابھری

''ہیلو....''جی کون.....؟

''میں.....میں.....ثانیہ.....ثانیہ.....بول رہی ہوں.......''

ثمرین نے بمشکل تمام حلق میں اٹک رہے جملوں کو آواز عطا کی۔ اس نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ثانیہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ برسوں سے جس کو دیکھنے اور سننے کی خواہش تھی، آج اس کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو دل خوشی کے مارے قلانچیں بھرنے لگا۔

''جی.....ثانیہ صاحبہ.....بتایئے...''

''میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں....مجھے آپ کا قلم بہت پسند ہے۔ کیا انداز تحریر ہے؟

''شکریہ.....ثانیہ صاحبہ....آپ کہاں رہتی ہیں؟

''جی مرادآباد....، کالج ہاسٹل میں''

''اوہ....آپ تو میرے ہی شہر کی ہیں۔ میں ریلوے روڈ پر ہوں۔ کبھی آیئے.......''

''جی......ضرور....... مجھے آپ کا ہر افسانہ اچھی طرح یاد ہے۔ آپ نے ''رشتوں کا کھوکھلا پن'' میں بڑا کمال کیا ہے۔؟

''بھئی واہ شکریہ! دراصل میں تو حقیقت کو ہی کہانی میں ڈھالتا ہوں۔ اب تو ہم بھی، آپ کے منتظر رہیں گے۔''

''مجھے تو زمانے سے آپ کو دیکھنے کا انتظار ہے۔''

''وقت ہو تو کل آجایئے.... حشمت ولا، ریلوے اسٹیشن کے پاس۔''

''جی بہتر......''

....

ثانیہ بے حد خوش تھی۔ آج اس کی برسوں کی خواہش کی تکمیل ہونے والی تھی۔ حشمت ضیاء اردو افسانے کا ایک بڑا نام تھا۔ حشمت ضیاء کی آواز سن کر ثانیہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے حشمت ضیاء سے ملنے کی پوری تیاری کی تھی۔ اپنا سب سے اچھا سوٹ زیب کر کے خود کو سنوارا تھا۔ اس نے ثمرین کو بھی اپنے ساتھ چلنے کو راضی کر لیا تھا۔

''ثمرین تم بھی چلو نا....... تم باہر میرا انتظار کرنا، میں صرف 10 / منٹ میں آجاؤں گی۔'' ثمرین ثانیہ کا ساتھ نبھاتی رہی۔

دونوں ریلوے روڈ پر واقع حشمت ولا کے سامنے پہنچ گئی تھیں۔ سڑک پر بہت ٹریفک تھا۔ سامنے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ ثانیہ نے ثمرین کو باہر ٹرک کے پاس انتظار کرنے کو کہا اور خود حشمت ولا پہنچ گئی۔ بیل بجا کر انتظار کرنے لگی۔ دروازہ کھلا۔

''آپ.....'' حشمت ضیاء خود دروازے پر تھے۔ ''جی ...میں ثانیہ۔'' ثانیہ مبہوت سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ حشمت ضیاء لمبے قد کے خوبرو جوان لگ رہے تھے۔ بالوں کی سفیدی اور چہرے پر ہلکی ہلکی جھریاں عمر کا اعلان کر رہی تھیں۔ رنگ کالا ضرور تھا مگر برا نہیں لگ رہا تھا۔

''اندر آیئے!''

''جی سر!'' ثانیہ، حشمت ضیار کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی تھی۔ بڑا شاندار گھر تھا۔ ثانیہ تو گھر کی اشیار کو دیکھ کر حیران تھی۔ گویا کسی محل میں آگئی ہو۔

''آپ تشریف رکھیں''، حشمت ضیار اسے صوفے پر بٹھا کر اندر چلے گئے تھے۔ ثانیہ بہت خوش تھی۔ اس کے ذہن میں حشمت ضیار کے افسانے اور ناول یکے بعد دیگرے آرہے تھے۔ حشمت ضیار کے کردار ہمیشہ ظلم و ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔

''لیجئے چائے، لیجئے......'' حشمت ضیار کی آواز پر وہ گھبرا کر سوچتے سوچتے، ماضی سے حال میں آگئی تھی۔

''آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟ نوکر وغیرہ......؟

''نہیں ثانیہ صاحبہ آج میں گھر پر اکیلا ہوں....''

''اور سنائیں...... حشمت ضیار چائے کا کپ لے کر صوفے پر اس کے قریب بیٹھ گئے تھے۔

''جی......'' ثانیہ دور ہونا چاہ رہی تھی، وہ اٹھی ہی تھی کہ حشمت ضیار نے اسے وہیں بٹھا دیا۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں..... چلیئے بتائیں آپ کو میری کون سی تخلیق زیادہ پسند ہے۔'' ثانیہ حشمت ضیار کے بے تکلف رویے پر حیرت زدہ تھی۔

''مجھے آپ کی زیادہ تر کہانیاں اور ناول پسند ہیں۔ دراصل آپ کے کرداروں میں ظلم و تشدد کے خلاف آواز اٹھانے کا جو جذبہ ہے، اس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔''

''آپ Relax ہو کر بیٹھ جائیں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں، اب آپ میری فین ہیں، کوئی غیر نہیں.....''

یہ کہتے ہوئے حشمت ضیار نے صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر پاؤں پھیلا دیے تھے۔ ثانیہ چونک پڑی تھی۔ خوف کی لہر اس کے بدن میں لہرائی تھی، مگر اس نے اپنے ڈر کو

ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسے اس کی چھٹی حس نے خطرے کا احساس کرا دیا تھا۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ پورے گھر میں وہ دونوں ہی تھے۔ اگر ایسے میں حشمت ضیار...... وہ اس سے آگے نہیں سوچ پائی۔ نہیں، نہیں.... حشمت ضیار ایسے نہیں ہو سکتے، وہ تو بڑے فن کار ہیں... ابھی وہ خیالات کے آنگن میں ڈری، سہمی ٹہل ہی رہی تھی کہ ایک ہاتھ اس کی پشت سے چپک گیا۔ اس کے بدن کا خون جم گیا تھا گویا اس کی کمر پر کوئی بڑی سی چھپکلی چپک گئی ہو۔ ذہن میں آویزاں فرشتہ نما قد آدم، شیشے جیسے جسم میں شگاف پڑ گیا تھا۔ تحفظ کا احساس، رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس سے تو ثمرین کو بھی ساتھ لے آتی تو بہتر ہوتا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس سے قبل کے لمحے کے کسی بھی حصے میں پشت چپکا سانپ اس کے جسم سے لپٹ جاتا اور اپنی گرفت مضبوط کرتا، وہ بجلی کی سی سرعت سے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی، پورے جسم کی طاقت سمیٹ کر دوڑ پڑی۔ کالا ناگ بھی لہراتا ہوا اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے صدر دروازے کو پار کیا۔ باہر آ گئی۔ سڑک کی دوسری جانب ٹرک کے پاس ثمرین کھڑی نظر آئی۔

''ثمرین.... ثمرین.....'' وہ بدحواسی میں چلا رہی تھی۔

ثمرین نے ثانیہ کی آواز پر گھبرا کر حشمت ولا کی جانب دیکھا۔ ایک کالا ناگ ثانیہ کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ دوڑ کر سڑک پار کرنا چاہتی تھی۔ دوسری جانب سے ثانیہ دوڑ رہی تھی۔ اسی لمحے اچانک ایک برق رفتار کار اپنا توازن کھو بیٹھی اور دوسری جانب کھڑے ٹرک سے جا ٹکرائی۔ بہت زوردار دھماکہ ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے متعدد دھماکوں سے پورا علاقہ دہل اٹھا۔ ٹرک اور کار کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ آگ اور دھوئیں کے بادلوں نے پورے علاقے کو گھیر لیا تھا۔ آس پاس کی دکانیں، گاڑیاں وغیرہ نذر آتش ہو گئی تھیں۔ چیخیں اور کراہیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں۔

آناً فاناً سائرن کے شور نے علاقے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ پولیس نے پورے علاقے کو سیل کر دیا تھا۔ لاشوں اور زخمیوں کو اٹھایا جا رہا تھا۔ نیم مردہ ایک لڑکی کو بھی

پولیس نے اپنی تحویل میں لیا تھا۔

....

ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات میں خبروں کا بازار گرم ہو گیا تھا۔

- مرادآباد میں خودکش بم دھماکے سے ریلوے روڈ لرز اٹھا۔
- دہشت گردوں کا ارادہ ریلوے اسٹیشن کو اڑانے کا تھا۔
- مشتبہ دہشت گرد تنظیم آئی ایم کی خاتون رکن نیم مردہ حالت میں گرفتار

....

کئی ماہ بعد..........

معروف افسانہ نگار حشمت ضیار کی کہانی ''دہشت گرد لڑکی'' شائع ہوئی جسے خاصی مقبولیت مل رہی تھی۔ اُدھر جیل میں بند ثانیہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ صبح کا اُجالا اندھیرے کو نگلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

□□□

تیری سادگی کے پیچھے۔ (دو)

جیل میں کسی بہت بڑے سنت کی آمد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک بڑے کمرے میں ایک طرف اسٹیج بنایا گیا تھا۔ سامنے راستہ اور راستے کے دونوں اطراف قیدیوں کے بیٹھنے کے لیے دریاں بچھائی گئی تھیں۔ ایک طرف خاتون قیدی اور دوسری طرف مرد قیدی بٹھائے گئے تھے۔ اچانک شور بلند ہوا۔

''بابا، آگئے۔ بابا آگئے........'' آگے آگے پولس والے اور پیچھے لوگ۔ ایک سفید پوشاک میں ملبوس، پگڑی باندھے، گلے میں موتیوں کی مالا۔ ہاتھ میں تسبیح، چہرے سے نور برستا ہوا۔ سفید داڑھی اور دمکتا ہوا چہرہ۔ دیکھتے ہی ایک سحر ساطاری ہو رہا تھا۔ بابا کو لے کر جیلر، پولس والے اور بابا کے ساتھی اسٹیج تک آئے۔ مائک پر جیلر آئے۔

''دیکھئے، جن لمحوں کا ہمیں انتظار تھا، وہ لمحے آگئے ہیں۔ ہمارے بے حد اصرار پر بابا سنت مہا دیو جی تشریف لے آئے ہیں۔ ہم سب ان کا سواگت کرتے ہیں........''

تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔ ادھر بابا نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر استقبال کو قبول کیا۔ آواز پھر بلند ہوئی۔

''سنت مہا دیو جی بہت بڑے بزرگ ہیں۔ آپ کے پورے ہندوستان میں سینکڑوں آشرم، درسگاہیں اور یوگ گرہ (یوگ کرانے کی جگہ) موجود ہیں۔ ان سب میں لاکھوں کروڑوں لوگ امن وشانتی کے لیے پوجا کرتے ہیں، بھگوان کی پرارتھنا کرتے ہیں۔ بابا جس پر بھی ہاتھ رکھ دیں، اس کا ہمیشہ کے لیے کلیان ہو جاتا ہے۔ آپ کے پروچن سے لاکھوں لوگوں نے برے راستے چھوڑ کر توبہ کر لی ہے۔ زندگی وہی ہے جو دوسروں کے کام

آئے۔ بابا مہادیو نے اپنا پورا جیون عوام کی سیوا کے لیے لگا دیا ہے۔ انہوں نے اس لیے شادی نہیں کی۔ کبھی کوئی عیش و آرام نہیں کیا۔ ہر وقت بھگوان کے چرنوں میں اپنی پرارتھنا کے پھول چڑھاتے رہتے ہیں۔'' ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ آواز پھر ابھری

''ہم نے بابا کو اس لیے بلایا ہے تاکہ آپ لوگ بابا کے پروچن سنیں اور اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کریں۔ خود بھی اچھے بنیں اور دوسروں کو بھی اچھا بنائیں۔ اب میں پرم پوجیہ سنت بابا مہادیو جی کو کشٹ دوں گا کہ وہ آئیں اور ہمیں اپدیش دیں.......''

تالیوں کی آواز کے ساتھ قیدیوں نے کھڑے ہو کر بابا کا استقبال کیا۔

بابا مائک پر آئے۔

''ہری اوم، ہری اوم......جئے شری رام، جئے شری رام..............''

عقیدت میں سر جھکے ہوئے تھے اور سب کے لبوں پر اوم کی گردان جاری تھی۔ سونیا کے دل کی دنیا کی عجیب حالت تھی۔ وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ اسے تو بابا کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا۔ بابا جو بظاہر اوپر سے نیچے تک سفید نظر آرہے تھے بمشکل تمام پچاس پچپن کے ہوں گے اور کیا نور تھا چہرے پر، لگتا گویا ایک روشنی ہے جو اپنے منبع سے خارج ہو کر اندھیرے پر ٹوٹی پڑ رہی ہو۔ ان کا ایک ایک شبد، سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔ واقعی یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ برائی تو برائی ہی ہوتی ہے۔ گناہ کا خیال بھی برا ہوتا ہے۔ پھر وہ کیا کرتی، وہ تو بالکل قصوروار نہیں تھی۔ سوچتے سوچتے سونیا دو سال قبل کی زندگی میں داخل ہوگئی۔ وہ بی ٹیک کی طالبہ تھی۔ اسے کہانی کار بہت پسند تھے۔ وہ ایک دن اپنے پسندیدہ کہانی کار سے ملنے ان کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بہت خوشی سے ملے۔ صوفے پر بٹھایا۔ چائے پلائی اور اچانک وہ سب کچھ ہوا جس کا اس نے خیال بھی نہیں کیا تھا۔ کہانی کار پھنکارتے ناگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ناگ اس کے جسم سے لپٹ جانا چاہتا تھا کہ اس نے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ آگے آگے وہ، پیچھے کالا ناگ، وہ گھر سے باہر آ گئی تھی۔ سامنے ٹرک کے پاس اس کی سہیلی کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے

کی طرف دوڑ لگائی، یہی وہ لمحہ تھا جب قیامت صغریٰ نمودار ہوگئی۔ مخالف سمت سے ایک برق رفتار کار آئی، اس کی سہیلی کو روندتی ہوئی کھڑے ہوئے ٹرک سے جا ٹکرائی۔ بس پھر کیا تھا۔ کار میں رکھا آتشیں مادہ یکے بعد دیگرے پھٹتا رہا۔ سارا علاقہ بم دھماکوں سے گونج اٹھا۔ چیخوں اور کراہوں سے فضا مکدر ہوگئی، یہ ایک آتنک وادی حملہ تھا اور اتفاق کہ اس کے ساتھ پیش آ گیا۔ پولس نے اسے گرفتار کرلیا تھا اور اس کی دلیلیں بے کار گئیں۔ اسے مجرم بنا کر جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ اپنے نا کردہ گناہوں پر نادم سی جیل میں زندگی گذارتی رہی۔ اسے اپنوں کا بھی کوئی علم نہیں تھا۔ ماں کہاں ہوگی۔ بابو جی کیا کر رہے ہوں گے۔ وہ سب تو بلیا میں تھے اور وہ مراد آباد کے ایک کالج میں بی ٹیک کر رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے ماں باپ کا کیا ہوا ہوگا۔ ماں کو کتنا ارمان تھا۔

''میرا تو ارمان ہے ہماری بیٹی خوب نام کمائے''

ماں کے لہجے میں خوشی اور امید کے دو رنگے بادل آپس میں گتھم گتھا تھے۔

''ہاں، تم دیکھنا، ہمارا بیٹا.....انجینئر بن کر خوب پیسے کمائے گا۔''

بابا کا اعتماد سر چڑھ کر بولتا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ بیٹا ہی کہا کرتے تھے۔ میری ضد پر انہوں نے مجھے اتنی دور بی ٹیک کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ آج وہ نہ جانے کہاں ہوں گے۔ خیال آتے اور جاتے رہتے۔ اور آنسوؤں کا تحفہ دے کر رخصت ہو جاتے۔

''جو انسان لالچ کرتا ہے، لوبھ کرتا ہے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ تو سب سے پہلے لالچ چھوڑو۔ پھر ہوس کو تو بالکل تیاگ دو۔ اپنے نفس پر کنٹرول کر لینے سے انسان، بھگوان کے درشن کے راستے پر چل پڑتا ہے۔'' بابا کچھ دیر رکے تو سونیا کے دل میں اٹھنے والا سوال، اچھل کر حلق کے راستے زبان تک آ گیا۔ اس نے سوال کرنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔

''سوال نہیں۔'' ایک پولس والا غرایا۔ لیکن سونیا کا بلند ہاتھ بابا کی نظر میں آ چکا تھا۔ وہ بولے۔

''کوئی بات نہیں، پوچھو بیٹے، کیا پوچھنا ہے۔''

''خود پر کنٹرول کیسے کرنا چاہیے۔'' سونیا نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''آپ کا کیا نام ہے، آؤ ذرا سامنے آجاؤ۔'' بابا کی آواز میں عجیب جادو تھا۔

''جی، میرا نام سونیا ہے۔'' سونیا یہ کہتے ہوئے اگلی صف میں آگئی۔

''ہاں بالکے تم نے اچھا پرشن کیا ہے۔ خود پر کنٹرول پانا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ہر وقت یہ دھیان کرو کہ تمہیں بھگوان دیکھ رہے ہیں۔ غلط کام کرنے سے پہلے اپنے اندر جھانکو اور یہ سوچو کہ کیا سماج کے اچھے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ دنیا کے کاریوں سے نپٹ کر بھگوان کا دھیان کیا کرو۔ روز کم سے کم 2 گھنٹے اوشیہ ایسا کرو۔ خود پر قابو ہوتا جائے گا۔''

بابا نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بیس برس کی ایک خوبصورت صحت منداور پر کشش لڑکی تھی۔ اس کی نظریں بابا سے ملیں۔ اسے ایسا لگا گویا آنکھوں کی شکل میں دو طاقت ور مقناطیس اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اور وہ بے قابو ہوئے جارہی ہے۔ اسے ایسا لگنے لگا کہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ وہ ہلکی ہلکی سی بابا کی طرف اُڑے جارہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر میں بابا کا پروچن بند ہو گیا۔ ایک آواز ابھری۔

''سونیا بیٹے۔ آپ چاہیں تو ہمارے آشرم آسکتی ہیں۔ وہاں ہم آپ کو دھیان، گیان سب سکھا دیں گے۔''

اس کی تو مانو دل کی مراد ہی پوری ہوگئی۔ وہ خود کو خوش نصیب سمجھ رہی تھی کہ سینکڑوں میں سے اسے منتخب کیا ہے۔ اس نے دیکھا بابا جیلر سے کچھ سرگوشی میں بات کر رہے ہیں۔

بابا کے جانے کے بعد جیلر اس کے پاس آئے اور بولے۔

''سونیا بابا اپنے آشرم میں بے سہارا لوگوں کو پڑھانے لکھانے کا کام بھی کرتے ہیں اور دھارمک گیان کے پاٹھ کی وِشیش پرارتھنا بھی۔ تم جانا چاہو تو ہم تمہیں بابا کے پاس بھجوا دیں گے۔''

''جیلر صاحب، میں تو خود کو بھاگیہ وتی سمجھوں گی اور جیسا آپ کا آدیش۔''

کچھ دن بعد سونیا کو خفیہ طریقے سے بابا کے آشرم میں پہنچا دیا گیا۔ آشرم کیا تھا۔

سورگ کا کوئی کونا ہو جیسے، بہت بڑا سا دروازہ۔ دروازے پر پہریدار۔ اندر چوڑی چوڑی سڑکیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب اشوکا کے لمبے لمبے پیڑ، گھاس کے بڑے بڑے لان۔ پھولوں کی کیاریاں۔ بیچ بیچ میں پانی کی چھوٹی چھوٹی نہریں۔ ان پر بنے پیارے پیارے پل۔ آشرم کو غور سے دیکھنے پر بھی اس کا کنارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بڑی دیر بعد ایک عالیشان عمارت کے سامنے جیل کی گاڑی رک گئی۔ دو پولس والے اس کے ہمراہ اندر داخل ہوئے۔ ایک آفس نما کمرے میں ایک شخص سے پولس والوں نے کہا۔

''ہاں بھئی، یہ بابا کے آشرم کی نئی سیوک ہیں۔ انہیں بابا کے پاس پہنچا دینا۔''

''ہاں، ہاں آپ اطمینان سے جائیں۔'' اور پھر سونیا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ کو ابھی آپ کا کمرہ دکھا دیا جائے گا۔ آپ آرام کرلیں۔ بابا خود آپ کو بلوا لیں گے۔''

پوری عمارت نہایت صاف ستھری اور دیدہ زیب تھی۔ منقش دیواریں، جا بجا آرٹ، پینٹنگس اور مذہبی تصاویر سے سجی ہوئی تھیں، لمبی لمبی راہداریاں، ہر موڑ پر پہریدار۔ اسے جس کمرے میں پہنچایا گیا تھا وہ بہت خوبصورت تھا۔ اٹیچ باتھ روم، ٹھنڈا اور گرم پانی، کمرے میں چھوٹا سا فریج۔ ایک طرف الیکٹریکل کیتلی اور چائے، چینی، کافی وغیرہ کے پاؤچ۔ خوبصورت وارڈ روب جس میں خوبصورت ہینگرز، کمرے کے بالکل وسط میں ایک ڈبل بیڈ، بیڈ کے سرہانے بجلی کے سوئچ، ہر طرح کی اطلاع کے لیے یہاں سوئچ لگے تھے اور ہر سوئچ کے نیچے اس کی تفصیل لکھی تھی۔ سونیا نے زندگی میں پہلی بار ایسا ماحول دیکھا تھا، اندر سے دروازہ بولٹ کر کے، دوپٹہ ایک طرف پھینکتے ہوئے بستر پر چاروں خانے چت ہو گئی۔ ابھی وہ ٹھیک سے لیٹی بھی نہیں تھی کہ کمرے میں ایک آواز ابھری۔ وہ ڈر گئی۔

''آپ لوگ آشرم نمبر 3 کے ہال نمبر 5 میں آجائیں۔ دھیان کا وقت ہو گیا ہے۔''

آواز کمرے کے ایک گوشے سے آرہی تھی۔ اس نے دیکھا وہاں دیوار پر ایک چھوٹا سا

اسپیکر لگا ہوا تھا۔ وہ جلدی جلدی خود کو تیار کرنے لگی۔ بہ مشکل پانچ منٹ میں تیار ہو کر نکلی، دروازہ لاک کیا۔ باہر راہداری میں پوری عمارت کا نقشہ دیوار پر چسپاں تھا۔ نقشے کے مطابق وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا ایسے ہی سینکڑوں کمرے ہیں اور ہر کمرے سے عورتیں باہر نکل کر آشرم نمبر 3 کی طرف جا رہی ہیں۔ ہال نمبر 5 میں عورتوں کی خاصی تعداد تھی، سب نے اپنے اپنے آسن سنبھال رکھے تھے۔ وہ بھی ایک خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں اعلان ہوا۔

''بابا پدھارنے والے ہیں۔ آپ لوگ سواگت مدرا میں آجائیں۔''

اور اس نے دیکھا سبھی نے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ لیے۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ اچانک ایک سفید جھونکا سا اندر آیا بابا اور ان کے پیچھے ان کے سیوک۔ بابا نے سفید دھوتی، کرتا پہن رکھا تھا، سفید داڑھی، سفید پگڑی، اس کے اوپر سفید انگوچھا، یہی لباس سیوکوں کا بھی تھا۔ روشنی اور خوشبو کے جھونکے ہال میں پھیل گئے۔ بابا اپنی مسند کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خواتین ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔ زیادہ تر لوگ سفید لباس میں ملبوس تھے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا پورے ہال میں برف کی دبیز چادر بچھا دی گئی ہو۔

''اوم شانتی اوم۔'' بابا کے منہ سے نور لفظوں میں ڈھل رہا تھا۔

''اوم۔۔۔اوم۔۔۔شانتی اوم'' سبھی دہرا رہے تھے۔

''آنکھیں بند کر کے بھگوان کا دھیان کریں اور اوم کہتے ہوئے سانس اندر لیں۔۔۔لمبی لمبی سانسیں لیں۔''

بابا کے کہنے کے مطابق پورا مجمع دھیان میں مگن ہو چکا تھا۔ ہر طرف بھگوان، ایشور کا ہی دھیان تھا۔ اوم کی گردان سے پورا ہال گونج رہا تھا۔

سونیا کے لیے یہ سب بالکل نیا اور عجیب تھا۔ اسے تو یہ سب سورگ کا نظارہ لگ رہا تھا۔ وہ تو بابا کی بہت بڑی فین بن گئی تھی۔ اسے پتہ چلا تھا کہ آشرم سینکڑوں بے سہارا، معذور اور بے گھر عورتوں اور لڑکیوں کی آماجگاہ ہے اور پورے ہندوستان میں بابا کے ایسے

درجنوں آشرم ہیں۔ کئی آشرم صرف عورتوں کے لیے ہیں، کچھ میں صرف مرد رہتے ہیں۔ کچھ چھوٹے بچے بچیوں کے لیے ہیں۔ کئی آشرم میں باضابطہ اسکول بھی ہیں۔ آشرموں میں طبی سہولیات بھی موجود ہیں۔ کھیل کود کے لیے بھی خاصے انتظام ہیں۔ سنا ہے خود بابا کو کئی کھیلوں کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ لیکن ان کے کھیل کا میدان الگ ہے۔ وہاں کوئی بھی بلا اجازت نہیں جا سکتا ہے، یا پھر جسے بابا بلا لیں۔ آشرم میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے مندر بھی بنے ہوئے تھے۔ کرشن مندر، درگا مندر، ہنومان مندر، رام مندر، شیو مندر غرض ہر دیوی دیوتا کے الگ الگ مندر بنے تھے۔ جس کی عقیدت، جس پر ہو، وہ اس مندر میں پوجا ارچنا کر سکتا ہے۔ ہر طرف پوجا، پراتھنا، گیان، دھیان کی ہی محفلیں اور پنیہ ہی پنیہ۔ پورا آشرم بھگوان کا گھر لگتا تھا۔ بابا کی حیثیت بھی بھگوان سے کم نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ انہیں بھگوان ہی مانتے تھے۔ ان سے اپنی پریشانیوں کا بیان کرتے۔ بانجھ عورتیں اپنی مرادیں لے کر جاتیں۔ روزگار، تعلیم، کاروبار ہر طرح کے مسائل کو بابا اپنے آشیرواد سے حل کر دیتے۔ بابا کے عقیدت مند ہندوستان ہی نہیں بیرونِ ملک بھی تھے۔ اکثر آشرم میں غیر ملکی آتے رہتے تھے۔ غیر ملکی خواتین کے رہنے کے لیے آشرم میں مخصوص حصہ تھا۔ ان کی خاطر تواضع کا معیار بھی بہتر تھا۔ سنا ہے بابا ان کا سارا انتظام خود کی نگرانی میں کرواتے تھے۔ اسے دوسری سیوکوں سے یہ بھی علم ہوا تھا کہ بابا زیادہ تر باہر رہتے ہیں۔ جب بھی آشرم میں ہوتے ہیں تو ''مخصوص دھیان''، کے لیے کسی ایک سیویکا کو اپنے مخصوص دھیان کچھ میں بلواتے ہیں۔ اسے یہ جان کر اور خوشی ہو رہی تھی کہ کسی دن بھی اس کا بلاوا آ سکتا ہے۔ کیا واقعی وہ بھگوان کے درشن کر سکے گی۔ وہ تو ایک ٹک انہیں دیکھے گی، انہیں چھو کر دیکھے گی۔ آخر بھگوان کیسے ہوتے ہیں؟ اس کے روم روم میں اس لمحے کا انتظار تھا۔

ایک رات، اسے اپنے بستر پر کچھ غیر معمولی بات محسوس ہوئی۔ اسے لگا کوئی آہستہ آہستہ اس کا بازو ہلا رہا ہے۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دیکھا تو آنکھوں کو یقین نہیں آیا۔ سامنے بابا کھڑے تھے۔ بھگوان کو اپنے اتنے قریب دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں

تیز ہوگئیں۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ اٹھ کر بھگوان کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ اچانک بابا کے مضبوط ہاتھوں نے مجھے زمین سے اٹھایا اور ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر لے چلے۔ میں کسی مقناطیسی قوت کے زیر اثر چلتی جا رہی تھی۔ مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ میں نے دیکھا بابا مجھے ایک خواب گاہ میں لے آئے ہیں۔ ہلکی ہلکی دودھیا روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ ایک وسیع و عریض، نہایت آرام دہ گدے والا پلنگ کمرے میں بچھا تھا۔ بابا نے مجھے بستر پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ میں تو روبوٹ کی طرح عمل کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا روشنی اندھیرے کا شکار ہوگئی تھی۔ پھر بابا نے ایک خاص پوجا شروع کی۔ میں پوری طرح بابا کی شخصیت اور تقدس کے حصار میں محصور تھی۔ میرے پورے جسم میں چینٹیاں سے رینگ رہی تھیں۔ نرم و نازک ہاتھوں کا لمس یوں محسوس ہو رہا تھا گویا روئی کے گالوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ میں کسی اور دنیا کے سفر پر تھی۔ پوجا ایسی بھی ہوتی ہے، مجھے پتہ نہیں تھا۔ مکھن پر گرم اور تیز چاقو نے اپنا کام کر دیا تھا۔ درد و کرب سے میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ تقدس اپنی موت مر چکا تھا۔ یہی مخصوص پوجا ہے۔؟ میں نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے دونوں لاتیں زور سے ماری تھیں۔ پل بھر میں ہی خود کو سمیٹا اور دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھول کر باہر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی، بھاگتی رہی۔ رات کے شاید 3 / بجے تھے۔ عمارت کے صدر دروازے پر تین گارڈ پہرہ دے رہے تھے۔ وہ میری حالت دیکھتے ہی معاملے کو بھانپ گئے۔ انہوں نے مجھے گارڈ روم میں بٹھا لیا۔ اچانک گارڈ روم کی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ اس سے قبل کہ میں چیختی، ایک مضبوط ہاتھ نے میرے منہ کو دبوچ لیا تھا۔ بجلی کے شدید جھٹکوں کی تاب نہ لا کر میں بے دم ہوگئی تھی۔ انہوں نے مجھ بے دم کو میرے کمرے میں لا کر پھینک دیا تھا۔ صبح 10 / بجے کمرے کا دروازہ کھلا، ایک خاتون آئی مجھ سے ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔

”یہ سب تو پوجا ارچنا کی پہلی منزل ہے۔ پر تمہیں لاتیں نہیں چلانی چاہیے تھیں۔“

"میں یہ سب، سارے زمانے کو بتا دوں گی۔ ذلیلو،تم سب گندی نالی کے کیڑے ہو۔ میں سفیدی کے پیچھے چھپے اندھیرے کو سامنے لا کر رہوں گی۔"

"زور سے نہ بولو۔ یہاں تم کچھ نہیں کر سکو گی۔ یہاں وہی ہوتا ہے جو بھگوان ہتے ہیں۔"

زندگی سب سے بڑی حقیقت ہے۔زندگی کے لیے کیا کیا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ آدمی چاہتے ہوئے بھی مر نہیں سکتا۔ پیٹ کی بھوک روکھی سوکھی سے کم کی۔ دن بھر کوئی نہیں آیا۔رات کے کسی پہر پھر دروازہ کھلا اور ایک سایہ اندر داخل ہوا۔ ہو بہو بابا کی قد کاٹھی اور باہت، بس سفید کی جگہ داڑھی سیاہ تھی۔ پھر ایک آواز ابھری۔

"تونے بابا کے لات ماری تھی"

"ن --- ن -- نہیں --میں--"

آواز کو کفنا دیا گیا۔

پھر رات خود پر شرمندہ ہو کر منہ چھپائے روتی رہی۔ بے دردی سے رات کے پیکر میں خنجر اتارے گئے۔ رات کی آہیں ابھرتی، ڈوبتی رہیں، پر کوئی ان آہوں پر کان ھرنے والا نہ تھا۔ روشنی کی ہلکی سی لکیر بھی نہیں تھی۔اندھیرے نے بے دردی سے روشنی کا تل کر دیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔طوفان جا چکا تھا۔اس کے چپے چپے پر کانٹے ل آئے تھے۔رات کو روز تیز ہوائیں چلتیں، روشنی کے جسم میں خنجر اتارے جاتے۔شدید وفان اپنے پیچھے درد کا ریگستان چھوڑ جاتا۔ یہ سلسلہ مہینوں تک دراز ہوتا گیا۔ مجھے مذہب، غیدی، بھگوان، ،دھیان ، پروچن ، پرارتھنا، پوجا، ارچنا جیسے لفظوں سے شدید نفرت بلکہ قارت ہو گئی تھی۔روشنی کے قتل ہونے کے قصے رات صبح کو بتاتی اور صبح دن کو بھی بتاتی رہی۔ یکن دن بھی منہ چھپائے رات کے پہلو میں آرام کرتا رہتا۔ آشرم کی رات، دن، شام، بح۔سب کا ایک ہی رنگ لگتا تھا۔گویا پورے آشرم میں،اندھیروں کی حکومت تھی۔اور سفید شاک پہنے پہریدار، اندھیرے کی پاسبانی میں تعینات تھے۔

وقت دبے پاؤں گذرتا رہا۔ رات کا سسکنا جاری رہا۔ ایک بار مجھے بہت خطرناک بیماری نے گھیر لیا۔ آشرم کے اندر کے ڈاکٹروں نے دوسرے شہر کے بڑے اسپتال کے لیے ریفر کر دیا۔ اسپتال میں، مجھے موقع ملا۔ میں نے اپنی بیماری کی پرواہ کیے بغیر راہِ فرار اختیار کر لی۔ قسمت نے ساتھ دیا۔ میں بھاگتی بھاگتی ایک شاہراہ پر چلی آئی۔ اچانک میں نے دیکھا ''آج اور ابھی'' چینل کی بڑی سی عمارت میرے سامنے ہے۔ میں دوڑتی ہوئی عمارت میں داخل ہو گئی۔ میرا سامنا ایک نوجوان سے ہوا۔ میں نے مختصراً اپنی کہانی سنائی۔ وہ مجھے خاموش کرتے ہوئے، چینل کے ڈائریکٹر کے پاس لے گیا۔ بھرپور پلان تیار کیا گیا اور ایک دن چینل ''آج اور ابھی'' سے میرا انٹرویو نشر کیا گیا۔ انٹرویو کا نشر ہونا تھا کہ پورے ملک میں جیسے ایک طوفان آ گیا ہو۔ دوسرے اخبار اور چینل والے، ''آج اور ابھی'' کی طرف دوڑ پڑے۔ چینل والوں نے سب سے پہلے پولس میں ایف آئی آر درج کرائی۔ پولس بھی حرکت میں آ چکی تھی۔ بابا کی تلاش شروع ہو گئی۔ ہر طرف ہر زبان پر بابا کے قصے تھے۔ بابا کے معتقدین نے ایک بڑا جلوس نکال کر اس کی مخالفت کی۔ میرے کردار پر حملے کیے گئے۔ نیچے سے اوپر تک حکومت ہل گئی تھی۔ بدنامی جونک کی طرح مجھ سے لپٹ چکی تھی پھر بھی میں خوش تھی کہ میں نے سادگی کے پیچھے کے سچ کو اور روشنی کے خول میں چھپے اندھیرے کو سامنے لا دیا۔

□□□

راستہ

''بابا میں کروڑ پتی بننا چاہتا ہوں۔''

ایک خوب رو صحت مند نوجوان جس کی عمر یہی کئی پچیس سال رہی ہوگی، نے ایک معروف جیوتشی بابا کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے کہا۔

مہارشی گوپال کرشن، مشہور و معروف بزرگ تھے۔ وہ آج کل کے بے شمار ڈھونگی سادھوؤں سے الگ تھے۔ ہر وقت ایشور سادھنا میں لگے رہتے۔ سادگی اور کم گوئی ان کی شناخت تھی۔ بھٹکے ہوؤں کو صحیح راستہ دکھانا ان کا کام تھا جو لوگ ان کے مشورے پر عمل کرتے، کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہر طرح کے ضرورت مند جن میں بے اولاد میاں بیوی، بے روزگار نوجوان، امن کے متلاشی لوگ اور ایشور تک پہنچنے کی لگن سر میں سمائے سادھوؤں وغیرہ کا ہر وقت مجمع لگا رہتا۔

ایک نوجوان کے جملے پر جہاں گوپال کرشن نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ محفل میں موجود سبھی حیرانی سے اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے جو کروڑ پتی بننے کی بات کرتا، لوگوں کو ادھر ادھر کرتا ہوا سیدھا بابا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بابا کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا سر بابا کے قدموں میں جھکا دیا۔

''بابا..... مجھے کروڑ پتی بننا ہے۔ میرے پڑوس کے کئی نوجوان بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ ان کے پاس بہت پیسہ ہے۔ میں نے بی ایس سی کرنے کے بعد کئی کورس کیے۔ خوب انٹرویوز دیے۔ لیکن چار۔ پانچ ہزار سے زائد کی نوکری نہیں ملتی۔ مجھے اپنی دو بہنوں کی شادی کرنی ہے۔ میرے پتا بوڑھے ہیں۔ پرائیویٹ سیکورٹی میں ملازمت کرتے

ہیں، انہیں تین ہزار روپے ملتے ہیں..... میرے دوستوں کے پاس بہت پیسے ہیں....'' کہتے کہتے نوجوان رونے لگا.... اس کی ہچکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''اٹھو..... اٹھو.... گھبراؤ نہیں۔'' بابا نے نوجوان کو پیار سے اٹھایا۔ ''آنسو پونچھ لو..... اور بتاؤ کروڑ پتی کیوں بننا چاہتے ہو؟'' ''مجھے بھی اپنے دوستوں کی طرح امپورٹیڈ گاڑی میں گھومنا ہے..... ایک فیکٹری...... ویل ڈیکوریٹیڈ آفس، آگے پیچھے نوجوان آفس گرلز.... گھر پر نوکر چاکر، ڈرائیور.....

''اچھا اچھا.... چلو ہم تمہیں ایسا نسخہ بتائیں گے جس سے تم کروڑ پتی ہی نہیں اور بھی امیر بن جاؤ گے.....''

''کیسے بابا...... مجھے تو بہت جلد کروڑ پتی بننا ہے۔ اگلے ہفتے میں اپنی گرلز فرینڈ کو اس کی برتھ ڈے پر سونے کی انگوٹھی گفٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس حرام خور کروڑ پتی باپ کے بیٹے سنجے کو اپنا بنا لے گی جو ہر وقت اسے سونے چاندی کے تحفے بھجواتا رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے... جیسا میں کہوں گا ویسا کرو گے....؟

''ہاں ہاں..... جلدی بتاؤ بابا.....''

''تو غور سے سنو۔ ویسے تو ہر شخص پیدائشی طور پر ہی کروڑ پتی ہوتا ہے۔ پھر بھی... کان لگا کر سنو۔'' بابا نے کچھ رازدارانہ انداز میں اپنی بات جاری رکھی۔ میرے پاس ایسے رئیس لوگوں کے فون آتے رہتے ہیں جنہیں اپنے عزیزوں کے لیے، ان کی زندگی کے لیے فوری طور پر کچھ نہ کچھ ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ تم ایسا کرو اپنی ایک آنکھ دے دو۔ اس کے عوض تمہیں میں مارکیٹ ریٹ سے بہت زیادہ رقم دلوا دوں گا۔ متل سوفٹ ویئر کمپنی کے مالک کی بیٹی کی دونوں آنکھوں کی روشنی چلی گئی ہے.... وہ ہر قیمت اپنی بیٹی کو روشنی عطا کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس کے لیے بیس لاکھ روپے تک دینے کو تیار ہیں..... تمہارا کام بن جائے گا۔

اور ایک بے نور لڑکی کی زندگی میں چپکے سے بہار آ جائے گی۔ تمہیں پیسہ کمانے کا موقع بھی مل جائے گا۔ پھر وہ تمھیں نوکری بھی دیں گے۔ دام کے دام، احسان کا احسان۔ نوجوان کے جسم میں جیسے کسی نے گرم سلاخ داغ دی ہو۔ کسی بچھو نے زور کا ڈنک مارا ہو۔ وہ اچھل پڑا۔ اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.... میں اپنی آنکھیں کسی قیمت پر نہیں دے سکتا..... چاہے کوئی مجھے ایک کروڑ بھی دے....''

نہیں.....نہیں....''

لڑکا کھڑا ہو گیا تھا، اس کے چہرے پر تناؤ تھا، سرخی اور پسینے کی بوندیں خوف و غصے کی کہانی بیان کر رہی تھیں۔

''کوئی بات نہیں بیٹے.... ناراض مت ہو۔ میرے ایک دوسرے دوست ہیں نوین شکلا۔ ان کی بیوی کے دونوں گردے خراب ہو گئے ہیں۔ بے چاری موت و زندگی کے درمیان جھول رہی ہے۔ شکلا جی کو گردہ کسی بھی قیمت پر چاہئے۔ پانچ سے دس لاکھ تو وہ کسی بھی وقت دینے کو تیار ہیں۔ تم کہو تو میں کچھ زیادہ بھی دلوا سکتا ہوں..... تمہیں یہ تو پتہ ہو گا ہی کہ انسان ایک گردے پر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ تمہارا یہ دان، کسی کو زندگی دان کر سکتا ہے اور پھر تمہیں دولت بھی ملے گی۔ آنکھ تو پھر ایسا انگ ہے کہ باہر دکھائی دیتا ہے، گردہ نکل جائے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا..... ابھی فی الحال تم یہ کر لو اور ان پیسوں کو صحیح جگہ Invest کرنا، بہت جلد آگے بڑھتے جاؤ گے اور کچھ عرصے بعد تم کروڑ پتی کیا ارب پتی بن جاؤ گے۔''

بابا گوپال کرشن کی بات سارے لوگ کان لگا کر سن رہے تھے۔ نوجوان کے چہرے پر مختلف رنگوں کا رقص جاری تھا۔ سینکڑوں نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا گویا وہ زنا کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اچانک وہ پیچھے گھوما، لوگوں کو پھلانگتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکلا اور بے تحاشا دوڑنے لگا۔ منہ سے نکلنے والے لفظ بے ترتیب ہو کر اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف دوڑ رہے تھے بلکہ ہوا کی قبر میں سمائے جا رہے تھے۔

''مجھے نہیں بننا کروڑ پتی....میں ایسا ہی ٹھیک ہوں۔''

''میرا ایک گردہ تو حرام خور ڈاکٹر ہیمنت پہلے ہی دھوکے سے نکال چکا ہے۔
نہیں.....نہیں مجھے نہیں بننا کروڑ پتی....''

□□□

بے آبرو

کئی دن سے کام والی نہیں آ رہی تھی۔ گھر کے کاموں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ پورے گھر کی جھاڑو لگانا کوئی آسان کام ہے۔ پلنگ کے نیچے جھک کر جھاڑو لگانا، واقعی بڑی ہمت اور محنت کا کام ہے۔ سیتا کی تعریف کرنی چاہیے۔ کتنی پھرتی سے سارا کام یوں نپٹاتی تھی گویا گھر گندہ ہی نہ ہوا ہو۔ دو دن تو کسی طرح اوپر اوپر سے جھاڑو ماردی۔ بغیر پوچھے کے گھر کتنے دن صاف نظر آئے گا۔ فرش کے کونے بہت جلد چغلی کھانے لگتے ہیں۔ ڈسٹنگ کے بغیر ڈرائنگ روم کتنا برا لگتا ہے۔ کیا کیا کروں؟ فائزہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جھاڑو ایک طرف رکھ کر وہ آرام کی سانس لینے لگی۔ تبھی خالد کی آواز آئی۔

''فائزہ۔ ارے بھئی۔ میرے جوتے نہیں مل رہے ہیں۔''

خالد تیار ہو کر آفس جانے والے تھے۔ جوتے نہیں مل رہے تھے۔ کئی دن ہو گئے سیتا کو، وہ تو چیزیں اپنی جگہ پر رکھتی تھی۔ تین دن میں سارا نظام تتر بتر ہو گیا۔ دو دن خالد کی چھٹی تھی۔ نہ جانے خالد نے جوتے کہاں اتارے تھے۔ شاید بیڈ روم کے پلنگ کے نیچے ہوں۔

''آئی۔ ابھی دیتی ہوں۔''

خالد بیڈ روم میں تیار بیٹھے تھے۔ میں نے جا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں نظر نہیں آئے۔ اب بغیر جھکے چارہ نہیں تھا۔ میں نے بہ مشکل تمام جہازی پلنگ کے نیچے خود کو گرا دیا تھا۔ نظریں دوڑائیں، جوتے اندر کی طرف تھے۔ ہاتھ بڑھائے مگر جوتے دور سے ہی منہ چڑا رہے تھے۔

''یہ شاہد کا بچہ بڑا شیطان ہے۔ جوتوں میں ٹھوکر ماری ہوگی۔''

ساری کوشش کے بعد بھی جب جوتے دسترس سے باہر رہے تو میں دوسرے کمرے میں رکھی جھاڑو اٹھالائی۔ جھاڑو ہاتھ میں لے کر، ہاتھ اندر لے جاتے ہوئے زور سے باہر کی طرف کھینچا۔ جھٹکے کے ساتھ جوتے باہر تھے۔ جوتوں کے ساتھ کسی اور چیز کی کھنک بھی سنائی دی۔

''ارے یہ تو میرے کان کا بندہ ہے۔ اسے تو میں پچھلے ایک ہفتے سے کھوج رہی تھی۔ پورا گھر چھان مارا تھا۔''

''تمہیں ہوش ہی کہاں رہتا ہے۔ اچھا، میں آفس نکل رہا ہوں۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ'' خالد جوتے پہن کر آفس کے لیے نکل گئے۔

آخر یہ بندہ پلنگ کے نیچے کیسے پہنچا۔ میں نے تو سیتا پر شک کیا تھا۔ یہ نوکر چاکر بھی بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کہیں گر گیا ہوگا اور سیتا کو کسی کمرے کی صفائی میں مل گیا ہوگا۔ سونے کا بندہ پا کر تو اس کی چاندی ہوگئی ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا۔

''سیتا دیکھنا، میرے کان کا ایک بندہ نہیں مل رہا ہے۔ تم نے تو کہیں نہیں دیکھا؟''

میں نے گھما پھرا کر بات کی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیتا یہ سمجھے کہ میں اس پر شک کر رہی ہو۔ جب کہ یہ حقیقت بھی تھی کہ مجھے اس پر شک تھا۔

''نہیں بی بی جی۔۔۔''

سیتا کے دوٹوک جواب پر میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ ضرور اسی حرافہ کا کام ہے۔ اس نے اسے چھپا لیا ہوگا اور یہی نہیں، یہ تو اب تک اسے بیچ آئی ہوگی حرام خور۔ اچھے خاصے آدھ تولے کے تھے، دونوں کچھ بھی نہیں تو تیس ہزار سونے کے حساب سے ایک بندہ پانچ ہزار کا تو ہوگا ہی۔ اللہ کرے کیڑے پڑیں اس کے۔ میں اندر اندر اس کو گالیاں بکتی رہتی۔ میرے بدلے رویے سے ایسا نہیں تھا کہ وہ انجان تھی۔ وہ تو بلا کی شاطر مزاج تھی۔ لمحے میں ہر بات کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔ عمر کے تقریباً 35 پڑاؤ پار کر چکی تھی۔ جسمانی اعتبار

سے آج بھی 25 کی لگتی تھی۔ پھرتی چستی تو دیکھنے لائق۔ کام ایسے کرتی جیسے جادو سے کر دیا ہو۔ لیکن کام میں ڈنڈی مارنا تو جیسے نوکروں کا حق ہے۔ جھاڑو لگاتی تو جلد بازی میں، پونچھا لگاتی تو اسے بخوبی نچوڑتی نہیں تھی۔ میں نے کئی بار اس کو ڈانٹا بھی تھا۔

''سیتا، یہ تم نے کیسی جھاڑو لگائی ہے۔ دیکھنا یہ کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہے۔''

''رہ گیا ہوگا____ بی بی جی، میں ابھی اٹھائے دیتی ہوں۔''

سیتا میرے گھر پچھلے چھ ماہ سے کام کر رہی تھی۔ میں نے اسے پورے گھر (چار کمرے اور لابی) کی صفائی یعنی جھاڑو اور پوچا کے لیے رکھا تھا۔ آگے پیچھے کے آنگن میں ہفتے میں دو بار پانی سے دھلائی بھی اس کے کاموں میں شامل تھی۔ ساتھ ہی کام کرنے کے بعد روزانہ گھر کا کوڑا بھی لے جانا، اس کا کام تھا۔ ان سارے کاموں کے اسے پانچ سو روپے دیتی تھی۔ یہی ریٹ چل رہا ہے۔ پوری کالونی میں اس ریٹ پر عورتیں کام کر رہی ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ بہت کم ہے۔ مگر ریٹ تو ریٹ ہے۔ یوں چاہے تم ان کو کچھ بھی دے دو۔ مگر ریٹ کبھی بگاڑنا نہیں چاہیے۔

سیتا کے کام پر آنے کے بعد مجھے آرام تو بہت ملا تھا لیکن میری دردسری میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ چوکنا سے رہو۔ کام کرے تو ساتھ کام کرواؤ۔ ورنہ چالو سا کام کر کے یہ جا، وہ جا، پھر حرافہ، کیسی بنی رہتی ہے۔ میں تو خالد کے گھر میں رہتے ہوئے بہت زیادہ دھیان رکھتی کہ سیتا خالد کے کمرے میں نہ جائے۔ خالد سے کمبخت کا سامنا ہی نہ ہو۔ مردوں کا کیا بھروسہ؟ نہ بابا نا، میں سیتا کو آزادی نہیں دے سکتی۔ پھر خالد کا ہنس مکھ مزاج۔ خالد بہت اچھے ہیں۔ ہر کسی سے ہنس کر ملنا اور بات کرنا ان کی عادت ہے۔ لیکن مجھے کئی بار ان کا نوکرانیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا برا لگتا تھا۔ کئی بار میں ٹوک بھی دیتی تھی۔

''سیتا، آج تو تم اچھی لگ رہی ہو__''

خالد اکثر سیتا سے سامنا ہونے پر کچھ نہ کچھ کہہ دیتے۔

''جی، بابو جی، دھنیہ واد'' سیتا کام چھوڑ کر خالد کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی۔

میرے سینے میں ایک ساتھ کئی خنجر اتر جاتے۔

''چلو اپنا کام کرو'' میں سیتا پر غصہ اتارتی اور خالد کو بھی آڑے ہاتھوں لیتی

''نوکروں کو منہ نہیں لگانا چاہئے۔''

خالد میری بات کا جواب دیے بغیر ہنستے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ خالد کی ہنسی میرے دل پر برچھی جیسی لگتی۔ کیا کروں کہ یہ کم بخت دل ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بات کو بھی دل پر لے لیتا ہے۔ سیتا، نوکرانی ہے لیکن پتہ نہیں کیوں، میں کبھی کبھی اسے اپنے مقابل سمجھنے لگتی ہوں۔ جب کبھی وہ اچھا سوٹ پہن کر آتی ہے تو مجھے اس سے چڑ ہو جاتی۔ حرام خور، کام کرنے آتی ہے یا خود کی نمائش کرنے۔ کیسے چست اور بھڑکاؤ کپڑے پہنتی ہے۔ لعنت ہے.....ایک دن میں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

''سیتا یہ تم کیسے کپڑے پہنتی ہو۔ ذرا خیال رکھا کرو۔''

''بی بی جی، ہم گریبوں کا کیا ہے، جو مل گیا پہن لیا۔ لوگ جیسا کپڑا دے دیتے ہیں، ہم پہن لیتے ہیں۔''

حرام خور کتنی معصوم بن رہی تھی۔ ''لوگ دے دیتے ہیں'' لوگ چست سلوا کر تو نہیں دیتے۔ بڑے بڑے گلے تو نہیں بنواتے۔

سیتا سے پہلے رادھا اور اس سے پہلے ٹینا گھر کے کام کاج کرتی تھی۔ سب کی کچھ عادتیں مشترک تھیں۔ مثلاً سبھی چھٹی کرنے میں ماہر ہوتی ہیں۔ چھٹی کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھتیں۔ صبح سے انتظار کرو، کام یوں ہی پڑا رہے۔ برتنوں کا انبار باورچی خانے میں یوں لگتا گویا کسی نالی کے منہ پر کوڑا کرکٹ کا ڈھیر پھنس گیا ہو۔ رادھا اکثر بیماریوں کا بہانہ بنا کر غائب رہتی تھی۔ ٹینا کے ساتھ اس کے دو بچے بھی اکثر آ جاتے۔ سارے گھر میں دھما چوکڑی مچاتے۔ مجھے غصہ تو بہت آتا لیکن کیا کرتی میری پرانی کام والی صبا کے بچہ ہونے والا تھا۔ وہ ایک سال سے بھی زیادہ سے غائب تھی۔ مجھے اس کا انتظار تھا۔ اس کی طویل غیر حاضری کے سبب مجھے دوسری عورتوں کو رکھنا پڑا تھا۔ سب کی اپنی خوبیاں اور کمزوریاں

تھیں۔ سیتا ان سب میں، سب سے زیادہ باتونی تھی۔ جب بھی آتی موقع دیکھتے ہی مجھ سے باتیں بنانے لگ جاتی۔

''ارے بی بی جی! کچھ سنا آپ نے؟''

سیتا اپنا لہجہ رازدارانہ بناتے ہوئے بولی۔

''کیا ہو گیا؟''

''پڑوس والے مشرا جی ہیں نا'' وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی

''ہاں، ہاں، کیا ہوا انہیں____؟''

''ارے ان کی بیوی کل انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ سنا ہے کسی مسلمان سے اس کا چکر چل رہا تھا'' وہ ذرا اور میرے نزدیک آئی اور کان کے پاس پھسپھسائی۔

''اس نے، اپنے پتی کو کسی کے ساتھ سونے والے کمرے میں دیکھ لیا تھا۔ بی بی جی! مشرا جی تو واقعی برے ہیں۔ ان کے یہاں تو کوئی عورت کام کرنا نہیں چاہتی ہے۔ میں تو دو دن ہی میں کام چھوڑ آئی تھی۔ مجھے ان کی نظریں خراب لگی تھیں۔''

''اچھا! اچھا ٹھیک ہے تم جلدی جلدی کام نپٹاؤ۔''

اور سیتا اپنا کام نپٹا کر چلی گئی تھی لیکن میرے لیے ایک ٹینشن، ایک دردِ سر چھوڑ گئی تھی۔ ارے مشرا جی ایسے ہیں اور وہ ان کی بیوی تو کتنی اچھی تھی۔ اچھا کیا وہ یہ سب دیکھ کر چلی گئی۔ مجھے بھی تو ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔ زمانہ خراب ہے۔ عورتیں آج کل فیشن پرست ہو رہی ہیں۔ مرد بھی کیا کریں۔ جب انہیں دعوت دی جائے گی تو، اسی لیے میں سیتا سے کئی بار کہہ چکی ہوں ذرا ٹھیک سے کپڑے پہن کر آیا کرے۔

ادھر میں نوٹ کر رہی ہوں کہ سیتا کے اندر کچھ اکڑ سی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اب وہ کام اپنی مرضی کے مطابق کرتی ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اس سے کہا:

''سیتا ذرا آج باہر کے فرش کی دھلائی بھی کر لینا۔''

''بی بی جی، آج مجھے جلدی جانا ہے، پھر کبھی کر دوں گی۔''

اور یہ پھر، کئی دن تک نہیں آئی۔ اب وہ اکثر جلدی آتی اور الٹا سیدھا کام کر کے یہ جا، وہ جا۔ کئی بار تو کوڑا بھی نہیں لے جاتی۔ پھر کبھی بھی چھٹی کر لیتی۔ اس نے کالونی کے کئی گھر پکڑ رکھے تھے۔ چھٹی کا بھی اس کا اپنا فارمولہ تھا۔ ایک ساتھ، ایک دن وہ سب کے یہاں چھٹی نہیں کرتی تھی۔ کبھی کسی گھر میں چھٹی تو کبھی کسی گھر میں۔ سیتا کے علاوہ بھی کالونی میں کئی عورتیں کام کرتی تھیں۔ سب ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ ایک کا جغرافیہ دوسری سے سن لو اور دوسری کی تاریخ تیسری سے پتہ کر لو سب ایک دوسرے کے توسط سے ہر گھر کے اندر تک پہنچی رہتی تھیں۔ انہیں سب پتہ ہوتا کہ کس گھر میں بچہ پیدا ہونے والا ہے اور کس گھر میں میاں۔ بیوی میں ان بن چل رہی ہے اور کس گھر میں 'وہ' کی وجہ سے ٹینشن بنی ہوئی ہے۔ سیتا اکثر پورے محلے کی داستان لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ میرے پاس وقت ہوتا اور موڈ ہوتا تو سن لیتی ورنہ وہ اپنا منہ چلاتی رہتی اور میں اپنا کام کرتی رہتی۔ سیتا کالونی میں کام کرنے والی عورتوں میں سب سے تیز اور طرار تھی۔ وہ دبنگ بھی تھی۔ مجال ہے جو کوئی عورت، اس کے گھر (کام والا) کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے اور جس گھر میں وہ کام کرنا شروع کر دے پھر اسے کوئی طاقت وہاں سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ دوسری عورتیں اس سے ڈرتی بھی تھیں کہ وہ سب کے کچے چٹھے، کبھی بھی منظر عام پر لا سکتی تھی۔ کوئی عورت، اس کی چھٹی والے دن اگر اسے کہیں دیکھ بھی لیتی تو، کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ ویسے سیتا بدتمیز نہیں تھی۔ وہ بہت پیار سے بات کرتی تھی۔ جب کئی دن سیتا نہیں آئی تو میں پریشان رہنے لگی۔ اکیلے گھر کا کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ میاں، بیوی، بیٹا۔ بیٹی۔ ساس، سسر بھی کبھی آجاتے تھے۔ اتنے لوگوں کا گھر، پورا گھر ہوتا ہے پھر چار کمروں کا مکان۔ جھاڑو ہی ڈھنگ سے لگائی جائے تو کمر ٹیڑھی ہو کر رہ جائے۔ اسی دوران مجھے پتہ چلا کہ میری پرانی خادمہ صبا آ گئی ہے اور اس نے کالونی میں کام بھی شروع کر دیا ہے۔ میں نے صبا کو بلوایا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔

''ارے صبا۔ تمہیں کیا ہوا، تم تو آدھی رہ گئی ہو۔ بچہ کیسا ہے؟ اب تو دو بیٹے ہو

گئے تیرے؟''

''جی آپا، پر کیا کروں جاپے میں مرتے مرتے بچی ہوں۔ بچہ گھر پر ہی ہوا۔ گھر پر کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا، دوسرے دن سے ہی خود ہی گھر کے کام کرنے پڑے۔ طبیعت بگڑ گئی۔' وہ بولتے بولتے رونے لگی۔

''نہیں نہیں۔ روؤ نہیں۔ تمہارے شوہر کا کیا ہے۔ اب تو دو بیٹے ہو گئے، سدھر گیا ہوگا۔ کچھ کام وام کرنے لگا۔''

''نہیں آپا۔'' وہ مزید رونے لگی۔ ''یہی تو غم ہے۔ میری تو قسمت ہی پھوٹی ہے۔ خود کام کروں، اسے کھلاؤں، بچے پالوں، پھر بھی مرد کو کوئی پھکر نہیں۔ کئی سال سے ایک عورت کے چکر میں پڑا ہے۔ نہ جانے اس حرام جادی نے کیا گھول کر پلا دیا ہے۔''

''تجھے تو سمجھایا تھا سب نے، تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟''

''نہیں آپا نہیں۔ میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ وہ مجھے مارتا ہے، پیسے لے جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں، وہ میرا مرد ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔''

عجیب فلسفے ہوتے ہیں ان لوگوں کے بھی۔ شوہروں سے پٹتی رہیں گی، بھوکی رہ لیں گی۔ ہر ظلم گوارا، لیکن مرد سے الگ ہونے کا تصور بھی برا۔ دراصل یہ ان کا ایمان ہوتا ہے۔ کتنی پختہ ہوتی ہیں یہ اپنے ایمان میں۔

''صبا تو، تو کل سے کام سنبھال لے۔ تیرے پیسے بھی بڑھا دوں گی۔''

''ٹھیک ہے آپا، میں کل سے آجاؤں گی____''

اور اگلے دن سے صبا نے کام سنبھال لیا تھا۔ سیتا جس دن سے غائب تھی، اس سے ایک دن قبل ہی پیسے لے گئی تھی، اس کا کوئی حساب بھی نہیں تھا۔ ایک دن وہ آئی۔ اس نے صبا کو کام کرتے دیکھا تو غصے کے مارے لال ہوگئی۔ چہرے پر سرخ رنگ کی لہریں اُٹھنے لگیں۔ لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ میں نے ہی کہا۔

''کہاں غائب تھیں ملکہ صاحبہ، کئی دن کے انتظار کے بعد میں نے صبا کو رکھ لیا۔''

مجھے پتہ تھا کہ وہ جتنے دن میرے یہاں سے غائب تھی اور لوگوں کے یہاں کام پر آئی تھی۔اسی لیے مجھے اس سے چڑ ہو گئی تھی۔ میں بھی موقع تلاش رہی تھی۔

''اچھا بی بی'' غصے اور طیش کو اندر سٹک کر سیتا چلی گئی تھی۔

کالونی کی کام والی عورتوں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ سیتا کو فائزہ نے کام سے ہٹا دیا ہے۔اب سیتا ساتھی کام والی عورتوں سے کٹ کر ادھر ادھر ہو جاتی تھی، کسی سے سامنا نہیں کرتی اور بات چیت تو اس نے بالکل بند کر دی تھی۔ فائزہ کے گھر کا کام ختم ہو جانے سے وہ خود کو لٹا لٹا محسوس کر رہی تھی۔

وقت گذرتا رہا۔ صبا گھر کے کام کاج کو سنبھال چکی تھی۔لیکن ایک تو صبا کی صحت جو کہ بہت کمزور ہو گئی تھی، اس سے زیادہ کام نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ جھاڑو، پوجا کے علاوہ دونوں وقت برتن مانجھنے کے لیے آتی تھی یعنی ڈبل کام۔

دس پندرہ دن بعد خالد باہر لان میں بیٹھے تھے۔تھوڑی دیر میں وہ اندر داخل ہوئے۔ میں سو رہی تھی۔

''ارے فائزہ، اٹھو بھئی، دیکھو تو کون آیا ہے۔''

میں آنکھیں مل کر اٹھی۔

''کون ہے یہیں، اندر بلا لو۔''

''بی بی جی نمستے......'' سیتا کی آواز پر میں بالکل جاگ گئی تھی۔

''ارے سیتا، کہاں ہو تم..........''

''ہاں، بی بی جی، آپ نے تو ہمیں ہٹا ہی دیا...''

''ہم نے نہیں، تمہارے کارناموں نے۔''

صبا کام کر رہی تھی۔ سیتا نے صبا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ صبا ڈر گئی جلدی سے بول پڑی۔

''آپ کرو گی کام، میرے پاس کئی کام ہیں۔ جھاڑو پوچے کا، آپ کر لو۔''

سیتا کی تو جیسے من کی مراد پوری ہوگئی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ ویسے بھی تیری ہڈیوں میں اتنا دم کہاں ہے کہ کمروں کے فرش صاف ہو سکیں۔'' پھر وہ میری طرف گھومی۔ مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگی، سوچ رہی تھی کہ میں کیا ردعمل ظاہر کرتی ہوں۔ میرے دل میں زیادہ دن کوئی بات نہیں رہتی۔ پھر سیتا کے کام کی میں قائل تھی۔

''ہاں، سیتا تم چاہو تو کرلو۔ کل سے آجاؤ۔ صبح 9 بجے....''

''جی بی بی جی......'' سیتا کے چہرے کے رنگ دیکھنے لائق تھے۔ احساسِ فتح سے اس کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ اسی دن پوری کالونی میں شور مچ گیا کہ سیتا کو فائزہ نے دوبارہ کام پر رکھ لیا ہے۔ سیتا اب پوری طرح کالونی میں کام کرنے والیوں میں چھا گئی تھی۔ اس کا رعب داب، اکڑپن اور وقار واپس آگیا تھا۔

اگلے روز جب دس بج گئے اور سیتا نہیں آئی تو مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے گھر اور باہر کے کئی چکر لگائے مگر وہ نہیں آئی۔ دوسرا دن بھی انتظار میں نکل گیا۔ سارا گھر گندہ ہو رہا تھا۔ تیسرے دن میں نے خود جھاڑو سنبھالی، مگر ایک تو میرا توانا جسم۔ دوسرے جلد ہی سانس پھول جانا، بڑی مشکل سے، کئی بار آرام کرنے کے بعد جھاڑو پوری ہوئی۔ صبا سے میں کئی بار کہہ چکی تھی۔ ''اری دیکھ، پتہ تو کر سیتا کا۔ جس دن سے کہہ گئی ہے۔ اس کا اتہ پتہ نہیں۔''

شام کو صبا آئی اور فائزہ سے بولی۔

''آپا......وہ سیتا...''

''ہاں کیا ہوا؟ ملی وہ___؟

''ہاں ملی تھی۔ کہہ رہی تھی___''

''کیا کہہ رہی تھی...؟''

''آپا اور بھی کام والی عورتیں تھیں میں نے جب اس سے کام کے لیے کہا تو بولی۔ ''اوئے چھپکلی (صبا بہت دبلی تھی) کیسا کام؟ میں نہیں کرتی ایسے گھر میں کام، جا کہہ

دینا، سیتا نے فائزہ کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ آپا میں تو منھ پھاڑے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ ساری کام والی عورتیں سیتا کو فخر سے دیکھ رہی تھیں۔

صبا نہ جانے اور کیا کیا کہہ رہی تھی مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے مجھے پگھلے ہوئے سیسے میں مجھے ڈبو دیا ہے۔ میں صبا کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی اور صبا اپنی بات کہہ کر کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس دن کے بعد میں خود کو عجیب حالت میں محسوس کر رہی تھی۔ جیسے لٹا پٹا مسافر۔ ایک نوکرانی کی چال میں پھنس کر میں بے عزت، بے آبرو، بے وقعت ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت سیتا کا چہرہ نظروں کے سامنے آ کر منہ چڑاتا رہتا۔ ذہنی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک دن میں نے صبا کو بلا کر اس کی چھٹی کر دی اور خود اپنے کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

□□□

لمبا آدمی

لوگ اسے دیکھنے آ رہے تھے۔ ایک ہجوم تھا جو اس سے تین چار فٹ کے فاصلے پر بنی لکڑی کی ریلنگ کے پاس سے دیکھتا ہوا گذر رہا تھا۔ کبھی کبھی تو نوجوان لڑکوں کے گروہ سے اسے بڑی خفت اٹھانی پڑتی۔ لڑکے شرارتیں کر کے، اسے پریشان کرتے تھے۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکوں کا ایک گروپ اس کے قریب آیا۔ ایک نے، دوسرے سے کہا:

''اوئے دیکھ! کتنا لمبا آدمی ہے۔ افریقہ کے جنگلوں سے لائے ہیں''

''ہاں یار۔ ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے لمبے بانس پر کپڑے ٹانگ دیے ہوں۔''

ایک نے ہاتھ ملانے کو ہاتھ آگے کیا۔ اس نے ہاتھ ملایا تو وہ بلبلا اٹھا۔ نجانے اس کے ہاتھ میں کیا تھا۔ کوئی نوکیلی چیز تھی۔ لڑکے تو رفو چکر ہو گئے تھے۔ اس کی ہتھیلی میں اب بھی درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

بلند شہر، اتر پردیش کا ایک قدیم شہر ہے۔ بہت پہلے اس کا نام برن تھا۔ اسی مناسبت سے یہاں کے باشندے خود کو برنی لکھتے ہیں۔ بعد میں اس کا نام بلند شہر رکھ دیا گیا۔ اس کے پیچھے بھی بتاتے ہیں کہ بلند شہر میں ایک علاقہ، اوپر کوٹ ہے جو حد سے زیادہ اونچائی پر ہے۔ اسی بلندی کی وجہ سے اس کو بلند شہر کہا جانے لگا۔ اوپر کوٹ کے ایک طرف کالی ندی بہتی ہے۔ یہ ندی بھی عجیب اور اس کا نام بھی عجیب ہے۔ کالی ندی میں ہمیشہ کالا پانی ہی بہتا رہتا ہے۔ شاید یہ گندے نالوں کا سنگم ہے یا پھر برسات کے علاوہ اس میں صاف پانی کے آنے کی کوئی سبیل نہیں۔ کالی ندی کو ندی کیوں کہتے ہیں یہ تو پتہ نہیں کیونکہ اس کی چوڑائی

ایک بڑے نالے سے زیادہ نہیں۔ یہ کہاں سے آتی اور کہاں کو جاتی ہے۔ یہ بھی معمہ ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اسے میرٹھ میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ جہاں اس کی چوڑائی اور کم دکھائی دیتی ہے۔ ہاں برسات میں یہ ضرور ندی جیسی جسامت اختیار کر لیتی ہے۔

بلند شہر میں کالے عام چوراہا خاصا مشہور ہے۔ سنا ہے 1857ء اور اس کے بعد انگریز حاکم، ہندوستانیوں کو اسی چوراہے پر پھانسی دیا کرتے تھے۔ اس لیے اس کا نام کالے عام چوراہا پڑ گیا۔ یہاں سے ایک سڑک بلند شہر چوک بازار کی طرف جاتی ہے۔ ایک جیل کی طرف، ایک کچہری، ایک ڈی ایم کے بنگلے کی طرف اور ایک بھوڑ چوراہے سے ہوتی ہوئی سکندر آباد اور دہلی کی طرف جاتی ہے۔ یعنی اس چوراہے سے پانچ سڑکیں نکلتی ہیں۔ یہاں سے دہلی کی طرف ایک ڈیڑھ کلومیٹر چلنے کے بعد ہی سیدھے ہاتھ کی طرف نمائش میدان ہے جس کے مغرب کی طرف ریلوے لائن ہے جو کبھی سنگم ایکسپریس تو کبھی پسنجر ٹرین کی دھک دھک سے دہلتی رہتی ہے۔ بہت کم ٹرینیں یہاں سے گذرتی ہیں۔ یہاں ریلوے کراسنگ پر اکثر ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ گھوڑا تانگے، بھینسا بگی، ٹرک، بسیں، موٹر سائکلیں۔۔ ہر وقت ایک اژدہام رہا کرتا تھا۔ اِدھر شہر انتظامیہ نے اس پر ایک پل تعمیر کروایا ہے۔ جو کچھ ماہ قبل ہی عوام کے لئے کھول دیا گیا ہے۔

نمائش میدان بھی خاصے کی چیز ہے۔ یہاں فروری کے مہینے میں نمائش لگا کرتی ہے۔ کیا عالم ہوتا ہے۔ پورا علاقہ بجلی کی چمک دمک سے زرق برق بنا ہوتا ہے۔ مین روڈ پر فینی، کھجلہ، قلفی اور کھانے کے ہوٹلوں کی قطار ہوتی ہے۔ نمائش میدان کے کئی گیٹ ہیں۔ گیٹ کے اندر دو، رویہ دکانوں کے سلسلے ہیں جو بالکل خط مستقیم میں ہوتے ہیں۔ بیچ بیچ میں ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر کاٹتے ہوئے راستے۔ راستوں پر لال رنگ کی چھوٹی بجری، جسے بدر پور بھی کہتے ہیں، پڑی ہوتی ہے اور کناروں پر سفید پتائی ہوتی ہے۔ بڑا حسین اور دلکش منظر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے جس نے بلند شہر کی نمائش نہیں دیکھی، اس نے کیا دیکھا۔

دراصل نمائش کا یہ قافلہ علی گڈھ سے جلوے بکھیرتا ہوا بلند شہر پہنچتا ہے۔ نمائش میں ہر طرح کی دکانیں ہوتی ہیں۔ ضرورت کا ہر سامان یہاں سستے داموں مل جاتا ہے۔ پھر سیر وتفریح کے لیے بجلی کے کئی طرح کے جھولے ہوتے ہیں۔ موت کا کنواں الگ رونق بکھیرتا ہے۔ سرکس کے مزے، سب سے الگ ہوتے ہیں۔ ہنسنے ہنسانے کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ ایک گیلری ہوتی ہے جس کے اندر عجیب وغریب آئینے لگے ہوتے ہیں، جن کے سامنے جانے پر آپ کی تصویر عجیب ہو جاتی ہے۔ کہیں بہت موٹی، کہیں پتلی، کہیں قد چھوٹا تو کہیں لمبا۔ یہی نہیں یہاں طرح طرح کے تماشے والے بھی ہوتے ہیں۔ سپیرے سانپ دکھاتے ہیں۔ بندر کا کھیل الگ، جادو کے نظارے الگ۔ ہر ایک مال دس روپے اور بیس روپے کی دکانیں بھی ہوتی ہیں۔ نشانہ بازی الگ، کہیں بندوق سے غباروں پر نشانہ لگایا جا رہا ہے۔ تو کہیں، بہت سارے سامان سامنے رکھے ہوئے ہیں آپ کے ہاتھ میں رنگ تھما دیا جاتا ہے، آپ رنگ کو پھینک کر جس سامان پر صحیح طور پر فٹ کر دیں گے، وہ سامان آپ کا ہو جائے گا۔ موت کی گلی جسے بھوت بنگلہ بھی کہتے ہیں، نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز ہوتی ہے۔ ایک اندھیری سی گپھا ہوتی ہے جو کئی موڑ کاٹتی ہوئی دوسرے، سرے پر کھلتی ہے۔ جیسے ہی آپ اندر داخل ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی ڈرانے والی چیز آپ کے سامنے ہوتی ہے۔ اکثر اس گیلری سے چیخنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ گلی کے بالکل آخری سرے پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اچانک ناظرین کی طرف جھکتا ہے۔ یہ ایسا منظر ہوتا ہے کہ اچھے اچھے ڈر جاتے ہیں۔ بہت سے بچوں اور کچھ بڑوں کا تو پیشاب تک نکل جاتا ہے۔

میلہ شباب پر تھا۔ ایک تو سردی کا موسم، دوسرے ہوا کے جھونکے، ہڈی تک کانپ جاتی ہے۔ لیکن نمائش میدان میں رات کی کڑکڑاتی ٹھنڈ بھی میلے کی سرگرمی سے پگھلنے لگتی ہے۔ میلے کے اندر سردی کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف شور شرابہ، کان پھاڑتی آوازیں۔ بجلی کے جلتے بجھتے قمقمے، حدِ نگاہ تک یہی جلوے ہوتے ہیں۔ اس بار میلے کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور پرکشش آئٹم۔ ساڑھے آٹھ فٹ کا آدمی تھا۔ میلے کے منتظمین نے

اس کا خوب اشتہار کیا تھا۔ اس کے لیے میلے کے درمیان میں ایک گیلری بنائی تھی۔ نصف دائرے نما گیلری میں اونچا چبوترہ بنایا گیا تھا۔ چبوترے کے باہر چار پانچ فٹ دور لکڑی کی بلیوں سے ریلنگ بنائی گئی تھی تا کہ اس کی حفاظت کو یقینی بنایا جا سکے۔ لوگ صرف دور سے دیکھیں، کوئی نقصان نہ پہنچا پائے۔ باہر اس کی بہت بڑی سی تصویر لگی تھی اور لکھا تھا ''دنیا کا سب سے لمبا آدمی''۔

نمائش میں اعلان ہو رہا تھا۔

''بھائیو! آیئے۔ دنیا کا سب سے لمبا آدمی دیکھئے۔''

''آیئے بہت کم وقت ہے.... جلدی آیئے۔''

ٹکٹ لے کر میں بھی قطار میں لگ گیا۔ میں جان بوجھ کر قطار میں سب سے پیچھے تھا۔ میرا پلان تھا کہ میں سب سے آخر میں جاؤں تا کہ اطمینان سے نہ صرف اسے دیکھوں بلکہ اس سے کچھ بات بھی کر سکوں۔ گیلری کے اندر داخل ہوا تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ راستہ تھوڑا سا گھوما تو میں نے دیکھا ایک بہت لمبا آدمی کھڑا ہے۔ مجھے ایسا لگا گویا میں، ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہوں، جہاں اس کے علاوہ سارے بونے ہیں۔ اس کا سر شامیانے کی چھت سے لگ رہا تھا۔ لوگ اسے ہائے، ہیلو، کہتے ہوئے گذر رہے تھے۔ کوئی نوجوان ہاتھ بڑھاتا تو وہ ہاتھ ملانے کے بجائے ہاتھ ہلا کر دور سے ہی ''وش'' کرتا۔ لوگ اسے دیکھتے ہوئے گذر رہے تھے۔ میری باری آنے میں کچھ منٹوں کی دیر تھی۔ میری نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ چہرہ بھی لمبوترہ تھا۔ کان بھی اتنے لمبے اور بڑے گویا چار آدمیوں کے کان جوڑ دیے گئے ہوں۔ ہلکی ہلکی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہونٹ تو غیر معمولی حد تک موٹے تھے۔ ناک بھی لمبے پتلے بیگن جیسی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میلہ شام میں پانچ، چھ بجے شروع ہو کر صبح پانچ بجے تک چلتا تھا۔ ایسے میں یہ آدمی، آرام کب کرتا ہوگا۔ کھڑے کھڑے تھک جاتا ہوگا۔ میری باری آنے سے قبل ہی وہ اچانک بیٹھ گیا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا بھی اتنا بڑا تھا کہ ہمارے کھڑے ہونے سے بھی اونچا لگ رہا تھا۔ ہاں

اس کا دبلا جسم ضرور عجیب لگ رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں اسے بھر پور کھانا نہیں ملتا ہو اور یہ کھانے کی کمی کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہو۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ ایک دیکھنے والے نے فرمائش کردی۔

''اسٹینڈ اپ، کھڑے ہو کر دکھاؤ۔''

لگتا ہے وہ صرف انگریزی ہی سمجھتا تھا۔ میں نے دیکھا وہ قہراُ جبراُ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کیا مجبوری تھی اس کی۔ ٹکٹ لے کر اندر آنے والے لوگوں کی باتیں ماننا، اس کا تجارتی فرض تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے بڑی رقم کے ٹکٹ تھے۔

اتفاق ہی تھا کہ میں اس قطار کا آخری ناظر تھا۔ اچانک ایک الارم بجا۔ پتہ چلا اب آرام کا وقفہ ہوا ہے۔ اندر آنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ لیکن جو اندر آ چکا تھا اس کو اجازت تھی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ چلو اسے آرام کا وقت بھی ملتا ہے۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر دیکھا۔ وہ بہت مضمحل لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس کے چہرے پر کرب کے سائے نظر آئے۔ ایسا لگا گویا مسکراہٹ کے پیچھے درد چھپا ہو۔ میں اس کے قریب پہنچا اور بولا۔

''سٹ ڈاؤن برودر۔''

اور وہ واقعی بیٹھ گیا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔

''ریلیکس''

میرے ایسا کہنے پر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ بولا کچھ نہیں۔ میں نے اسے دوستی کی آفر دی تو وہ رک رک کر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا:

''او کے، تھینک یو۔ وھاٹ نیم ؟''

میں سمجھ گیا وہ میرا نام پوچھ رہا تھا۔

''مائی نیم از سلمان اینڈ یورس؟

''ولیم ۔۔ ولیم بین ''

تھوڑی ہی دیر میں زبانوں کی لڑکھڑاہٹ کے باوجود میں نے اس کے بارے

میں تھوڑا بہت جان لیا تھا۔ میں بھی فرصت سے تھا۔ پھر گیلری میں کام کرنے والا ایک لڑکا میرا اشنا سا تھا۔ میں اس سے کہہ کر آیا تھا کہ مجھے کچھ دیر رکنا ہے۔ ولیم کا بھی آرام کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا وہ پاس ہی اسٹول پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل رہا تھا۔ گلاس بھرنے کے بعد، اس نے میری طرف بڑھایا، میں نے شکریہ ادا کیا اور منع کیا تو وہ پانی ایک ہی سانس میں پی گیا۔ پورا جگ خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے شناسا لڑکے کو بلا کر دس چائے لانے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ اسے جگ میں دینے کے بعد میں نے گلاس میں چائے لے لی اور ہم لوگ چائے پیتے پیتے باتیں کرنے لگے۔ دوران گفتگو میں نے اس کے ملک، خاندان، بیوی، بچے، کام وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کی باتیں سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

افریقہ کے گھانا کا رہنے والا تھا۔ اس کی شادی کو پانچ سال ہوئے تھے۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ وہ ایک مال نما بڑی دکان پر سیلز مین کا کام کرتا تھا۔ اس کی لمبائی اکثر اس کے لیے نقصان دہ ہوتی تھی۔ اس کے لباس میں کپڑا بھی خاصا لگتا تھا۔ اس کا کرتہ پاجامہ بھی آٹھ میٹر سے کم میں نہیں سلتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر تو وہ اندر ہی داخل نہیں ہو پاتا تھا۔ تنخواہ سے کسی طرح وہ گھر کا گذارہ کر رہا تھا کہ ایک دن وہ دکان سے لوٹا تو اس کی بیوی گھبرائی ہوئی بولی:

''اوہ ولیم، ہم بڈی کڈنیپڈ بنجامن''

اس کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ بیوی کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس نے بیٹی کو بہت ڈھونڈا۔ کہیں نہیں ملی۔ تھک ہار کر میاں بیوی غم زدہ سے گھر میں بیٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ امید کی کرن جاگی تو ولیم اور اس کی بیوی دونوں فون پر لپکے۔ ولیم نے فون رسیو کیا۔

''ہیلو، لی سین، یور ڈاٹرا ز ود ھ می، کم ود ھ ففٹی تھاؤزنڈ ڈالر اینڈ ٹیک ہر بیک، فیلنگ سو، یور چائلڈ ول بی کلڈ۔ یو ہیو اونلی ون ویک، نوٹ دا ایڈریس۔۔''

ولیم ہیلو ہیلو کہتا رہا لیکن آنے والی آواز نے ایڈریس بتانے کے بعد فون رکھ دیا تھا وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے پتہ نوٹ کر لیا تھا۔ پچاس ہزار ڈالر تو انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے، وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی بیوی کا روتے روتے برا حال تھا اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دیکھا، اس کا پڑوسی ایک اجنبی کے ساتھ کھڑا ہے۔ پڑوسی نے اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ یہ موہن لال شرما ہیں جو انڈیا میں ایک سرکس چلاتے ہیں، تمہیں لینے آئے ہیں۔ بہت اچھے پیسے دیں گے۔ کھانا، پینا، کپڑا رہنا، فری ہوگا اور روزانہ تمہیں تین سو ڈالر دیں گے۔ تم سوچ کر بتا دینا۔ یہ کل تک تمہارے جواب کا انتظار کریں گے اور وہ دونوں چلے گئے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، اسے اپنی پیاری سی بیٹی بنجامن یاد آرہی تھی۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ اندر کام کر رہی تھی اور اس کی چار سالہ بیٹی باہر کھیل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر آئی تو بنجامن کو نہیں دیکھا۔ ادھر ادھر ڈھونڈا نہیں ملی۔ لوگوں سے پوچھا تو کسی نے بتایا ایک آدمی، انکل بتا کر اسے لے گیا ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ آج کل بچوں کا اغوا عام بات ہوگئی تھی۔

وہ جس شاپ پر کام کرتا تھا۔ وہاں اسے دو ہزار ڈالر مہینہ ملتے تھے۔ ہندوستان کے سرکس کا آفر تو بڑا پرکشش تھا۔ لیکن بیوی کو کہاں چھوڑے گا۔ اس نے بیوی سے بات کی۔ دونوں نے مشورہ کیا کہ بیٹی کو واپس لانے کے لئے پچاس ہزار ڈالر کی رقم جمع کرنے کو یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ موہن لال شرما سے سودا کر لیں گے کہ وہ ہمیں پچاس ہزار ڈالر دے دے اور ہم اس سے جب تک رقم پوری نہ ہو جائے کام کرنے کا اگریمنٹ کر لیں گے۔ موہن لال شرما نے بہت غور و فکر کے بعد جواب دیا تھا کہ وہ اس کے لیے تیار ہے مگر کم از کم تین سال کا کنٹریکٹ سائن کیا جائے اور یہ پچاس ہزار کی رقم وہ انڈیا پہنچ کر ہفتے بھر میں دے سکے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا، دونوں نے باہم مشورہ کیا اور موہن لال شرما کی بات مان لی کہ ولیم انڈیا سے پیسہ بھیج دے گا اور اس کی بیوی، بنجامن کو چھڑا لے گی۔ سائننگ اماؤنٹ کے طور پر موہن لال شرما نے دو ہزار ڈالر اس کی بیوی کو دے دیے۔

اس طرح ولیم 'اپنا سرکس' میں کام کرنے کے لیے انڈیا آ گیا تھا 'اپنا سرکس' والوں کا بڑا نیٹ ورک تھا۔ میلوں میں ان کے سرکس لگتے ساتھ ہی ساتھ دوسرے آئٹمس کی گیلری بھی۔ ولیم جب انڈیا آیا تو بلند شہر کی نمائش شروع ہونے کو ایک آدھ دن باقی تھا۔ جلدی جلدی ایک مخصوص گیلری کا انتظام کیا گیا اور خوب اشتہار بھی کیا۔ ٹکٹ بھی ہائی فائی۔ ولیم کو پتہ نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا ہے؟ وہ تو سرکس میں کام کرنے کی خاطر آیا تھا کہ وہاں جوکر کا کام کرلے گا۔ پہلے بھی وہ سرکس میں یہ کام کر چکا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ اسے ''دنیا کا سب سے لمبا آدمی'' بنا کر پیش کیا جانے والا ہے تو اس نے احتجاج کیا تھا۔ لیکن وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے مجبور تھا۔ اسے تین دن کے اندر پیسے افریقہ بھیجنے تھے۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ پوری رات کھڑے کھڑے اس کو کافی تھکاوٹ ہونے لگی۔ ہر دو گھنٹے کے بعد اسے 10-15 منٹ آرام کے ملتے تھے اور صبح ۱ بجے کے بعد وہ سو پاتا تھا۔ تین دن پورے ہونے والے تھے۔ اس نے موہن لال شرما سے پیسوں کا تقاضا کیا تو اس نے دو دن بعد دینے کا بہانہ بنا دیا۔ ولیم غصے میں بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس نے موہن لال سے پہلے تو درخواست کی۔

''سیو مائی ڈاٹر سر پلیز''

موہن لال پھر بھی نہیں پسیجا اور اپنی مجبوری ظاہر کرتا رہا۔ اس پر ولیم کو غصہ آ گیا اور وہ موہن لال پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ اس کے لڑکوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ سب نے مل کر اس کی اچھی خاصی دھنائی کر ڈالی۔ بے چارہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ بری طرح رونے لگا۔ اس نے احتجاجاً دو دن شو میں حصہ بھی نہیں لیا۔ جس کے بدلے موہن لال شرما کے آدمیوں نے اس کے کھانے پینے میں کٹوتی کرنی شروع کر دی تھی۔

پیٹ کی آگ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ وہ اس سے وہ سب کروا لیتی ہے جو اسے قطعاً ناپسند ہو۔ ولیم عجیب حالات کا شکار تھا۔ اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ اس کی معصوم

چار سالہ بیٹی بنجامن اغوا کاروں کے قبضے میں تھی۔ بیوی کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ وہ صرف بیٹی کی رہائی کی خاطر پیسوں کی ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے گھانا سے انڈیا آ گیا تھا۔ یہاں اس کا کوئی نہیں تھا۔ اسے موہن لال سے یہ امید نہیں تھی۔ اب اگر پیسے وقت پر نہ پہنچے تو، وہ لوگ اس کی بیٹی کو مار ڈالیں گے۔ یہ سوچ کر اس کے جسم میں سرسری سی دوڑ جاتی۔ وہ زارو قطار رونے لگتا۔ پر کیا کرے۔ غیر ملک، اجنبی ماحول، کوئی دوست نہ ہمدرد، پھر اگر وہ بھاگ بھی جائے، تو اسے راستوں کا علم نہیں تھا۔ اس کی لمبائی بھی اس کام میں مانع تھی۔ ہزاروں میں بھی دور سے پہچان لیا جاتا۔ یہاں اس کی زندگی بھی عجیب ہو گئی تھی۔ سرکس میں قید جانور کی طرح، زندگی گذار رہا تھا۔ وقت پر تماشہ دکھاؤ، دل چاہے یا نہ چاہے عوام کی خاطر کھڑے ہو کر مسکراتے رہو۔ اس کی ٹانگوں پر ورم آنے لگا تھا۔ ابھی وہ خیالوں میں گرتا پڑتا اپنی بیٹی اور بیوی تک پہنچا ہی تھا کہ ایک تیز سائرن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ آواز شو شروع ہونے کا الارم تھا۔ پھر کسی نے آ کر زور سے کہا

''ولیم۔ بی ریڈی''

اس کے جی میں آیا کہ کہنے والے کو اپنی گرفت میں لے لے اور اس کا خون پی جائے۔ یہ سب اس حرام خور، بے ایمان، دغا باز، موہن لال شرما کے پلے تھے۔ جس نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا سرکس میں لا کر اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ ایک بار اس نے بھاگنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس نے ان میں سے کئی ایک کو دھول چٹا دی تھی، لیکن موہن لال کے سیکورٹی گارڈز نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور کسی نے وزنی چیز سے اس کی کمر پر وار کیا تھا۔ وہ بلبلانے لگا اور زمین پر گر کر رونے لگا تھا، پھر دوبارہ اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میلہ شباب پر تھا۔ رات کا پھیلتا سیاہ آنچل، آنچل میں منہ چھپائے جلتے بجھتے ستارے، آسمان چیرتی آوازوں کا جنگل، روشنی کی جھیلیں، انسانوں کا سمندر اور شور کے جھرنے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ''دنیا کا سب سے لمبا آدمی'' گیلری میں بھی شو کا پہلا ریلا آ گیا تھا۔

ولیم نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ آنکھوں کے کونے صاف کر لیے تھے۔ کھڑے ہو کر کپڑے وغیرہ درست کئے اور ایک مخصوص پوز کے ساتھ، چہرے پر مسکراہٹ بھی لے آیا تھا۔ جب کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے، بیوی کی روتی ہوئی تصویر، بیٹی کی جدائی کا غم اور خود کے آنسو چھپے تھے۔

''ہائے، ہیلو____''

''اوئے لمبو____''

لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے۔ کوئی کچھ کہتا، تو کوئی کچھ کمنٹ کرتا۔ آج میں بھی کئی دن بعد پھر آیا تھا۔ میں اکثر ایسے اوقات کا انتخاب کرتا کہ مجھے اس سے کچھ دیر باتیں کر نے کا موقع مل جائے۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو وہ نیچے بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ شاید اسے میرا انتظار تھا۔

''فرینڈ، آئی ایم ہیلپ لیس،۔۔پلیز ہیلپ می۔۔۔پلیز''

وہ روتا جا رہا تھا اور اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ آنسو اس کے رخساروں پر یوں بہہ رہے تھے گویا آنکھوں کے پیالوں میں طغیانی آ گئی ہو اور پانی کنارے توڑ کر باہر آ رہا ہو۔ میں نے اسے چپ کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس سے خیریت پوچھی تو اس نے موہن لال شرما کی بدمعاشی کی تفصیل سنائی، وہ بار بار ''بنجامن، بنجامن'' بول کر رونے لگتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں اس کی مدد کروں گا۔ میں نے اس کی بیوی کا نمبر لیا اور اس سے کہا کہ میں خیریت پوچھ کر ایک آدھ دن میں بتاؤں گا۔ اسے روتا ہوا چھوڑ کر میں بوجھل دل اور بھاری قدموں واپس آ گیا۔

کئی دن کی مسلسل کوشش کے بعد ولیم کی بیوی سے فون پر بات ہوئی۔ وہ تو کچھ بھی بولنے کے لائق نہیں تھی۔ اسے تو ولیم کی خیریت بھی نہیں ملی تھی۔ ایک طرف تو بیٹی کی جدائی دوسری طرف شوہر سے دوری۔ دونوں باتوں نے اسے توڑ دیا تھا۔ بیٹی کی رہائی کا وقت بھی گذر گیا تھا اور ولیم نے پیسے نہیں بھیجے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ولیم کو کیا ہوا۔ اب اس

کی بیٹی کا کیا ہوگا؟ میں نے جب اسے بتایا کہ میں ولیم کا دوست سلمان ہوں اور ولیم خیریت سے ہے لیکن اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور وہ موہن لال شرما کے قبضے میں پھنسا ہوا ہے۔ میں نے دلاسہ دیا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا جب کہ مجھے بھی پتہ تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، ولیم کا کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ موہن لال شرما بہت بڑا آدمی تھا۔ سیاست میں بھی اس کا دخل تھا۔ غنڈوں کا ایک گروہ ہر وقت سرکس اور دوسرے کاموں کی نگرانی میں لگا رہتا تھا۔

اگلے ہی دن میں نے ولیم کو اس کی بیوی کی خیریت بتا دی کہ وہ بیٹی اور تمہارے لیے فکر مند ہے۔ وہ بنجامن کا نام سنتے ہی رونے لگا۔ اس کی حالت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ مگر اس سے موہن لال اور اس کے آدمیوں کو کوئی مطلب نہیں تھا وہ تو ''دنیا کا سب سے لمبا آدمی'' شو سے پیسے بٹور رہے تھے۔

ایک دن میں نے یوں ہی ولیم کی بیوی کو فون کیا تو فون کسی اور نے اُٹھایا کیا۔ آواز کسی عورت کی تھی

''ہیلو، ہو آر دیئر۔۔؟''

''آئی ایم سلمان اے فرینڈ آف ولیم، ٹیل اباوٹ ہز وائف اینڈ ڈاٹر''

اور جواب میں جو بات میرے کانوں تک آئی۔ میں اسے سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میرے بدن سے روح کو الگ کر دیا ہو، میرے کانوں میں کھولتا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ میں داستان کے شہزادے کی مانند پتھر کا ہو گیا تھا۔ آواز نے کہا تھا کہ اغوا کاروں نے بنجامن کو مار ڈالا اور یہ خبر جب ولیم کی بیوی کو ملی تو اس نے خودکشی کر لی۔ فون بند ہو چکا تھا۔ بہت دیر کے بعد ہواس درست ہونے لگے، لیکن میں خود کے اندر امڈنے والی چیخ اور آنسوؤں کے سیلاب کو روک نہیں سکا اور ایک دلدوز چیخ فضا میں بکھر گئی۔

''یا اللہ.........''

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ میں یہ دلدوز خبر ولیم تک کیسے پہنچاؤں گا۔ انسان قدرت کے ہاتھوں کتنا مجبور ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے ولیم سے ملاقات کا ایسا وقت منتخب کیا جب زیادہ رش نہ ہو۔ جیسے ہی میں گیلری میں پہنچا ولیم میری طرف لپکا۔ گویا اسے میرا بے صبری سے انتظار تھا۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے آنے والے لمحات کا احساس کرا دیا تھا۔ وہ بے چینی سے بولا۔

''وھاٹ ہیپن''

میں اس کی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میرے اندر ہمت نہیں تھی کہ میں اسے ایسی دلدوز خبر دوں۔ میں گلا صاف کرنے لگا۔ آواز جیسے لفظوں سے رشتہ توڑ چکی تھی۔ ایک بار کچھ کہنے کو میرا منہ کھلا، ہوا نکلی، لیکن لفظ باہر آنے کی ہمت نہیں کر پائے۔ میں نے دوبارہ اپنے پورے جسم کی طاقت کو زبان میں سمویا اور اٹک اٹک کر بولا۔

''سوری ولیم!۔۔۔ یور ڈاٹر۔۔کلڈ۔۔۔ یور وائف۔۔۔ کمیٹڈ۔۔۔سوسائڈ۔۔''

میرے جملے ابھی ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ ولیم زور سے دہاڑا

''نو۔۔۔۔نے ور۔۔۔''

مجھے لگا طوفان آ گیا ہو۔ کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ہوا، میلے میں در آئی تھی۔ وہ فوراً چبوترے سے نیچے کودا۔ چیختا چلاتا ہوا گیلری کے راستے کی طرف لپکا۔ کپڑے کے پردوں کو چیرتا ہوا وہ باہر پہنچ گیا تھا۔ گیلری کے سکیورٹی گارڈز سمجھ ہی نہیں پائے کہ معاملہ کیا ہے۔ میں بھی ولیم کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ گارڈز نے ایک ساتھ مل کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ مگر انسان کو روکا جا سکتا ہے۔ طوفان کو کون روک پایا ہے۔ ولیم نے گارڈز کو اس طرح بکھیر دیا تھا گویا روئی کے گڑیا گڈوں کو اچھال دیا ہو۔ وہ سامنے آنے والی ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا جا رہا تھا۔ آج اس کے اندر طاقت کا طوفان آ گیا تھا۔ جو بھی اس کے سامنے آتا، زمیں بوس ہو جاتا یا آسمان میں اچھال دیا جاتا۔ وہ تو طوفان بنا ہوا تھا۔ اس کا

رخ موہن لال شرما کے آفس کی طرف تھا۔ وہ ہر چیز کو تہہ و بالا کرنے پر اتارو تھا۔ میلے کی پولیس بھی حرکت میں آچکی تھی۔ اس نے ولیم کو گھیرنے کے لیے اس علاقے کا محاصرہ کرلیا تھا۔ پولیس آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کر رہی تھی۔ ایک طرف سے بچوں کا ایک گروہ آرہا تھا۔ اس میں چار پانچ سال کے لڑکے لڑکیاں، ہاتھوں میں کھلونے لیے، آئس کریم کھاتے ٹہلتے آرہے تھے۔ اچانک ولیم ان بچوں کی طرف لپکا۔ پولیس بھی حرکت میں آگئی تھی۔ ولیم بچوں کے قرب پہنچ گیا تھا۔ اس نے ایک چار سالہ بچی کو اٹھا لیا تھا۔ وہ اسے اپنے منہ تک لے جانے والا تھا کہ اچانک بہت زور سے فائر ہوئے۔ پولیس کی گولیوں نے اس کی ٹانگوں کو بے کار کر دیا تھا۔ ایک گولی اس کے سینے کے پار ہوگئی تھی۔ آسمان سے باتیں کرنے والا دنیا کا سب سے لمبا آدمی، چھوٹا ہو گیا تھا۔ وہ بچی سمیت زمین پر آرہا تھا۔

''بنجامن۔۔۔بنجامن''

اس کے منہ سے اب بھی آوازیں نکل رہی تھیں۔ بچی اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھی اور اس کا منہ بچی کے منہ سے مس کر رہا تھا۔ جبکہ وہ دائمی سفر پر نکل چکا تھا۔

□□□

بنتے مٹتے دائرے

وہ آسمان سے نہیں اتری تھی۔ اسی گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی اور اب گاؤں کی پہچان بنی ہوئی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جس نے ظلم سہا اور آہستہ آہستہ خود کو ظلم کے خلاف کھڑا بھی کیا۔۔ وہ عام سی لڑکی تھی۔

وہ، ماتا دین اور شربتی کی اکلوتی اولاد تھی۔ بچپن ہی سے وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن نین نقش ایسے کہ چہرے پر، کشش اور بھولپن ہمیشہ طاری رہتا۔ دس بارہ سال کی عمر تک تو وہ توتلی بھی تھی۔ زیادہ تر لوگ اسے سننے کے لیے بے سبب بھی چھیڑتے۔

''کہاں دالی ہے لڑتی؟'' گاؤں کے چاچا ایشر نے اسے چھیڑا۔

''کہیں نادالی، بت'' اس کے جواب پر لوگ ہنس پڑے۔

''الے کٹوں دانت پھار لیے ہو؟'' وہ تھوڑا طیش میں آ گئی۔

ایشر چاچا، رامو، جوگندر، موہن سب مزید ہنسنے لگے۔

''میں تھمالی چھکایت کلوں گی۔ بابا چھے'' وہ ان کی ہنسی سے تنگ آتے ہوئے بولی۔

''دابول دے، بابا چھو......''

رامو اس کی نقل کرتے ہوئے بولا تو سب ایک بار پھر ہنس پڑے۔ اتنے میں ماتا دین وہاں آ گیا۔ ماتا دین بھنگی تھا۔ اسے ویسے بھی گاؤں کے لوگ بہت کمتر سمجھتے تھے۔ اکثر تو اس سے دور دور ہی رہتے۔ ماتا دین بڑا محنتی اور ایماندار تھا۔ وہ گاؤں کے گھروں میں کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی شربتی بھی گاؤں میں کام کیا کرتی تھی۔ دونوں نے اپنی بیٹی کو بڑے

جتن سے پالا تھا۔ وہ دونوں اپنی بیٹی کو، اپنے کام سے دور رکھنا چاہتے تھے اور اسے پڑھانا بھی چاہتے تھے۔ بڑی منت سماجت کے بعد انہوں نے اپنی بیٹی کا نام گاؤں کے اسکول میں لکھوادیا تھا۔ آشا، ہاں یہی نام تھا اس کا۔ آشا اسکول جانے لگی تھی۔ عمر میں تو وہ سات آٹھ سال کی ہوگی جب اسے اسکول میں بٹھایا گیا۔ اپنی کلاس میں وہ سب سے بڑی تھی۔

''بابا...... دیکھو۔ یہ سب مدے تنگ کرلے ہیں۔''

آشا نے ماتادین کو دیکھ کر آواز لگائی۔ ماتادین نے چاچا ایشر اور دوسرے لڑکوں سے نرمی سے کہا۔

''اسے تنگ نہ کرو، جاؤ اپنا کام کرو۔''

اور سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ آشا محنت کرنا جانتی تھی۔ اسکول میں بھی وہ خوب دل لگا کر پڑھتی۔ لیکن دوسرے بچے اسے دھتکارتے رہتے۔ کبھی کبھی تو استاد بھی اس کے خلاف ہوجاتے۔

''سل، دیکھو، یہ مندو (منجو) مجھے تنگ کل لئی ہے۔''

اس نے منجو نامی اپنی کلاس میٹ کی شکایت ٹیچر سے کی۔ منجو گاؤں کے مکھیا کی بیٹی تھی۔ مکھیا کا گاؤں پر راج تھا۔ اس کے دو ہٹے کٹے بیٹے تھے، پھر چار پانچ مشٹنڈے بھی ہر وقت بیٹھک پر پہرہ دیتے رہتے تھے۔ مکھیا گری راج برہمن تھا اور اس کے پاس قریب سو بیگھے زمین تھی۔ اتنی زمین تو گاؤں کے اور بھی کئی لوگوں کے پاس تھی، مگر گری راج دبنگ قسم کا آدمی تھا۔ وہ کئی بار سے الیکشن جیت رہا تھا۔ گاؤں کے آدھے سے زیادہ لوگ اس کے ووٹر تھے۔ باقی ماندہ، غریب، مزدور اور کمین، اس کے رعب داب کے آگے آواز تک نہیں نکال سکتے تھے۔ ماتادین تو بے چارہ غریب گاؤں کی گندگی صاف کرنے کا کام کرتا تھا۔ کام کے بدلے لوگ اسے اناج دیتے تھے۔ گاؤں کے لوگ اس کے علاوہ ایک چیز اور دیتے تھے نفرت، حقارت اور پھٹکار۔ ماتادین اور اس کی بیوی شربتی ایسی ہی بے عزتی، نفرت اور حقارت کے نوالے اپنے پیٹ میں اتار اتار کر زندگی گذار رہے تھے، مکھیا تو اسے اکثر ذلیل

کرتا رہتا تھا۔

''کیوں بے ماتا دین، دودن سے صفائی کے لیے نہیں آیا۔ کہاں مر گیا تھا۔''

''سرکار، میں شربتی کے گاؤں چلا گیا تھا، کچھ کام تھا۔''

''بتایا کیوں نہیں۔ یہ کام کون کرے گا تیرا باپ۔''

''ہمیں کریں گے سرکار.........''

اور وہ مکھیا کے گھر کے ٹائلٹ اور باتھ روم صاف کر کے ہی گھر واپس جاتا۔ گاؤں میں اب ترقی ہونے لگی تھی۔ پختہ مکانات بننے لگے تھے۔ گاؤں کی سڑکیں بھی اچھی ہو گئی تھیں، کھیتی میں اب ٹریکٹر اور دوسری مشینوں کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ گاؤں کے مکھیا اور اس جیسے امیر گھروں میں نیا فیشن آ گیا تھا۔ موٹر سائیکلیں، کاریں، کولر وغیرہ لگ گئے تھے۔ ٹائلٹ اور باتھ روم بن گئے تھے۔ اب دیر سویر امیروں کو رفاہِ حاجت کے لئے جنگل جانا نہیں پڑتا تھا۔ لیکن گاؤں کی تقریباً نصف سے زیادہ آبادی آج بھی سو سال پیچھے ہی تھی۔ گاؤں میں ایک ہی اسکول تھا۔ اسکول کے لیے بھی گری راج ہی نے سرکار کو زمین دی تھی۔ اسکول کے ماسٹر بھی مکھیا کو سلامی مارتے تھے۔ مکھیا کی بیٹی منجو اور آشا ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ منجو کا اسکول میں سکہ چلتا تھا۔ وہ سب پر سواری کرتی تھی۔ ماسٹر بھی اسے کبھی کچھ نہیں کہتے۔ بچے بھی اس کی شکایت ماسٹر سے کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ وہ آشا کو اکثر چھیڑتی رہتی تھی۔ ایک بار آشا نے جب منجو کی شکایت ماسٹر سے کی تو منجو کو بہت غصہ آیا۔ اس نے ماسٹر کے سامنے ہی آشا کی چٹیا پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیا۔ آشا کو اس اچانک حملے کی امید نہیں تھی۔ وہ گر تو گئی پر اٹھتے ہی اس نے منجو کے بال پکڑ لیے۔ اس سے قبل کے منجو، آشا کے قابو میں آجاتی، ماسٹر نے منجو کو بچالیا اور آشا کو پکڑ لیا۔ آشا کے ماسٹر کی گرفت میں آتے ہی منجو نے آشا کو ایک زبردست گھونسہ رسید کر دیا۔ آشا کی ناک سے خون نکل آیا۔ ماسٹر نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے آشا کو ڈانٹا۔

''تم بے کار میں لڑنے لگتی ہو___''

''سل اس نے میلی لبل تول دی تھی اور یہ مدے دھولتی رہتی ہے۔'' (اور یہ مجھے گھورتی رہتی ہے)

''مجھے منجو نے بتایا تم نے اسے گالی دی تھی۔''

''اب آئندہ اگر کسی سے بھی لڑیں خاص کر منجو سے تو تمہارا نام کاٹ دیا جائے گا۔''

آشا ہکّا بکّا سی ماسٹر کو دیکھ رہی تھی۔ ایک تو اس کی غلطی نہیں تھی۔ دوسرے اسی کو مارا بھی گیا اور ماسٹر کی ڈانٹ بھی اسی کے حصے میں.... یہ سب کیا ہے؟ اسے پتہ نہیں تھا کہ سماج میں کیا ہو رہا ہے؟ کون بڑا ہے، کون چھوٹا؟ اس کے بابا اور ماتا کو گاؤں میں سب برا کیوں سمجھتے ہیں؟ آشا ان باتوں سے بے خبر تھی۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ مکھیا کیا ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ پھر منجو کیوں اس کو ہمیشہ برا سمجھتی ہے۔ اس سے دور دور رہتی ہے۔

گھر آ کر جب اس نے اپنی ماں سے سب کچھ بتایا تو شربتی نے اسے سمجھایا۔

''بیٹا تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

''وہ مدے مالتی ہے۔ میں بھی اُتھے مالوں گی۔''

''نہیں بیٹا، اس کے پاپا مکھیا ہیں۔ ان کے پاس طاقت ہے''

''میلے پاپا بھی تاکت ول ہیں۔ میں بھی تم نہیں ہوں۔ مجھ میں بھی تاکت ہے۔''

وہ بے چاری وہی سوچ اور کہہ رہی تھی، جو جانتی تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ طاقت کیا ہوتی ہے۔ گاؤں کا مکھیا یا پردھان کتنا طاقت ور ہوتا ہے۔ اسے علم ہی نہیں تھا۔ شربتی نے اپنی بیٹی کو لپٹا لیا اور بے تحاشہ پیار کرنے لگی۔ اس کے زخم کو اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔۔ بیٹی کو پیار کرتے کرتے شربتی کا پاؤں یاد کی کیچڑ پر پھسل کر ماضی کے آنگن میں جا پہنچا۔

گرمی کے دن تھے۔ دن میں لو چلتی تھی۔ راتیں بھی گرم تھیں۔ ایسے میں گیہوں

کے کٹائی کے دن بھی آ گئے۔ دن دن بھر تپتی دو پہر میں کھیت کاٹنا آسان کام نہ تھا۔ ماتا دین، اس کے بابا طوطا رام، شربتی اوران کی اکلوتی بیٹی آشا۔ ماتا دین اور طوطا رام تو پو پھٹنے سے پہلے ہی کھیتوں میں پہنچ جاتے اور کٹائی شروع کر دیتے۔ شربتی، سورج نکلنے کے بعد گھر کے کام کاج نپٹاتی۔ کھانا تیار کرتی اور آشا کو گود میں لے کر کھیت پر جاتی تو اسے پیڑ کی چھاؤں میں بٹھا دیتی۔ وہ کھیلتی رہتی اور سب کھیت کاٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ مکھیا کے کھیت میں کام کرتے یہ ان کی تیسری پیڑھی تھی۔ بارہ مہینہ، تیسوں دن کام۔ کبھی کھیت کی جتائی تو کبھی بوائی ___ کبھی سردی کی ٹھٹھرتی راتوں میں پانی لگانا، فصل کاٹنا، اناج نکالنا۔ کام تھا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اسی کام اور کھیت میں ماتا دین کے دادا، ان کے بھائی اور ماتا دین کے چاچا اور بابا نے عمریں کھپا دیں تھیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے مگر کام تھا کہ قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی ماتا دین سر پکڑ کر سوچا کرتا، بھگوان کا بھی کیا نیائے ہے۔؟ ہمیں نسل در نسل دوسروں کی غلامی اور مزدوری، اور مکھیا کے خاندان کو نسلوں سے نوابی اور عیش ___ ہے بھگوان یہ کیا ہے؟ کیا ہم اور ہماری نسلیں اسی پرکار دوسروں کے گھر اور کھیت پر کام کرتے کرتے مٹی میں مل جائیں گی۔ کیا ہماری نسل میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہوگا۔؟

”ارے ماتا دین، کہاں کھو گیا۔ دیکھ تیری مانگ تو پیچھے رہ گئی۔“

اور ماتا دین سوچ کی بستی سے باہر آ جاتا۔ جلدی جلدی اپنے حصے کی مانگ پوری کرتا۔ سر کا پسینہ خود راہ بناتے، پورے جسم کا سفر کرتے ہوئے ٹانگوں تک پہنچ جاتا۔ سورج دیوتا کو ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے بادلوں میں منہ چھپا لے۔ ہمیشہ قہر برساتی آنکھوں سے گھورتا رہتا ہے۔ وہ اور شربتی تھوڑی دیر تھکان دور کرنے کے لیے پیڑ کے نیچے بچی کے پاس چلے گئے تھے۔ طوطا رام کام کرتے رہے۔ ماتا دین نے کمر سیدھی کرنے کو خود کو زمین سے ملا دیا تھا۔ پیڑ کی چھاؤں، ہلکی ہلکی پچھوا ہوا، ویسے تو ہوا گرم تھی لیکن پیڑ کے نیچے آرام پہنچا رہی تھی، کچھ ہی دیر میں ماتا دین کو نیند آ گئی تھی۔

ماتا دین خواب کی حسین وادیوں میں تھا۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ اس کی بڑی سی بیٹھک پر مجمع لگا ہے۔ گاؤں کے امیر اور رئیس بیٹھے ہیں۔ گری راج بھی ایک کونے میں بیٹھا ہے۔ ماتا دین نے گری راج کو پکارا۔

''گری راج ___ وہاں کیوں بیٹھا ہے۔ ادھر آ۔''

''جی سرکار.......''

گری راج کے پاس آنے پر ماتا دین نے اپنا داہنا پاؤں اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔

''لے داب..........''

اور گری راج پاؤں دابنے لگا تھا۔

''اور گری.......کل سے تم گھر کا کام بھی سنبھال لو۔ میری مالش کا کام تم خود کرو گے۔ اپنے بیٹوں کو بھی لگا لینا۔''

''جی حضور......''

''اور اپنی لوگائی کو بھی مالکن کی کھدمت کے لئے بھیج دینا۔''

گری راج کی گردن ہل ہل کر جی کہہ رہی تھی۔

اچانک ایک زور کی آواز ہوئی۔ ماتا دین درد سے بلبلاتا ہوا جاگ پڑا۔ مکھیا کے آدمی ادھر آ گئے تھے اور ان میں سے ایک نے اس کے بہت زور کی لات ماری تھی۔

''کیوں بے حرام خور، کام چھوڑ کے مزے سے سو رہا ہے۔''

بے چارہ درد سے کراہتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔

''حرام کی توڑتا ہے اور اپنی لوگائی کو بھی آرام کراتا ہے۔''

''ماپھ کر دو۔ جرا سی آنکھ لگ گئی تھی۔'' ماتا دین گڑگڑایا۔

اس سے قبل کے مکھیا کے دوسرے آدمی کی لات ماتا دین کے جسم کو چاٹتی، شربتی بیچ میں آ گئی اور گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

''ہجور گلتی ہوگئی۔ ہم ابھی کام پر جارہے ہیں۔''

شربتی نے جلدی سے آشا کو اٹھایا، ماتا دین کا ہاتھ پکڑا اور چلچلاتی دھوپ میں بابا طوطا رام کی طرف چل پڑی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ماتا دین سے پہلے طوطا رام اور ان کے پتا جی بھی اسی طرح کی زندگی گذار چکے تھے۔ ہر وقت کام ہی کام۔ کام کے بدلے بس، باسی اور بچا کھچا، کھانا ___ لیکن محنت کے بعد تو یہ کھانا بھی ایسا ہی لگتا جیسے من وسلویٰ ہو۔ ایسے ہی بے شرمی کے لقمے تہہ در تہہ اپنے معدوں میں اتار کر ماتا دین کی پوری نسل پہلے جوان، پھر بوڑھی اور پھر اپنے انجام تک پہنچی تھی۔

''ماں، او ماں.........تھانا دونا، بھوت لدی ہے۔''

آشا کے جملوں نے شربتی کو ماضی کے آنگن سے نکال کر حال کے کمرے میں لا دیا۔ آج جب اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تو اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ اسے بھگوان پر بھی غصہ آیا۔

ہے بھگوان تو نے ہمیں، اتنا چھوٹا کیوں بنایا۔ ہمیں بھی برہمن بنا دیتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔ دنیا ہمیں بھنگی کہتی ہے۔ زبردستی کام کرواتی ہے۔ مزدوری بھی پوری نہیں دیتے۔ اوپر سے نفرت کرتے ہیں۔ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ہے بھگوان کیا ہمارا خون اور ان کا خون الگ ہے۔ کیا ہماری کاٹھی اور ان کی کاٹھی میں فرق ہے۔ ہے بھگوان میں نے بہت سہہ لیا۔ تو نے نیچ ذات میں پیدا کیا، میں کچھ نہیں بولی۔ تو نے ماتا دین سے بیاہ دیا، جس کے گھر کوئی سکھ نہیں ملا، میں کچھ نہیں بولی۔ اپنی نظروں سے پتی کو جوتوں سے پٹتے دیکھا، میں کچھ نہیں بولی۔ لیکن آج میری بیٹی کو مارا گیا ہے۔ اب حد ہوگئی ہے اب میں بولوں گی۔ میں اپنی بیٹی کی بے عزتی نہیں سہہ سکتی۔ میں اپنی بیٹی کو غلام نہیں بننے دوں گی۔ اسے پڑھاؤں گی، لکھاؤں گی۔ یہ پڑھ لکھ کر بڑی بنے گی۔ کسی کے گھر بیگار نہیں کرے گی۔ ایک دن لوگ میری بیٹی کے آگے پیچھے گھومیں گے۔

آشا کی دوبارہ آواز پر وہ واپس ہوئی اور اسے کھانے کو دیا۔

اگلے دن شربتی، آشا کو چھوڑنے اسکول گئی تو ماسٹر سے الجھ گئی۔

''ماسٹر صاحب! کل آپ نے میری بیٹی کو پٹوایا۔''

''ارے شربتی، تجھے پتہ ہے تو کیا بول رہی ہے۔ مکھیا کی بیٹی ہے وہ۔''

''ہاں! ہاں! مجھے پتہ ہے پر میری بیٹی کا کوئی کسور ہو تب نا___''

شربتی اپنا احتجاج درج کرا کے جا چکی تھی۔ اسے وہ دن بھی یاد آ رہا تھا جب اس نے آشا کے داخلے کے لیے ماسٹر سے بات کی تھی۔ پہلے تو ماسٹر نے منع ہی کر دیا تھا۔ پھر جب اس نے ماسٹر کی خوشامد کی تو وہ تیار ہوا۔ لیکن مکھیا سے پوچھنے کے بعد داخلہ لینے کی بات کی اور ایک دن جب مکھیا اسکول میں آئے تو ماسٹر نے آشا کے داخلے کی بات رکھی۔

''ہا۔ ہا... بھئی واہ۔ اب یہ بھی پڑھیں گے۔ چلو یہ بھی کر لو۔ ماسٹر کر لو بھئی داخلہ۔ پڑھ کر کیا کریں گے۔ ہم بھی دیکھیں گے۔ کرنا تو ہماری غلامی ہی ہے........''

مکھیا کے لہجے میں تمسخر اور حقارت تھی۔

شربتی کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ تو بس آشا کا داخلہ چاہتی تھی۔ شروع شروع تو آشا کو اسکول میں بڑی پریشانی ہوئی۔ ایک تو اس کا توتلہ لہجہ، دوسرے سب کچھ نیا نیا۔ پھر کچھ دنوں بعد آشا کا دل پڑھائی میں لگنے لگا تھا۔

وقت گذرتا گیا۔ چار پانچ سال کیسے ہوا ہوئے، پتہ نہیں چلا۔ اب آشا جوانی کی دہلیز پر پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا رنگ سانولا ضرور تھا مگر چہرے کی ساخت غضب کی تھی۔ آنکھیں بڑی حسین تھیں۔ ایک کشش تھی اس کی آنکھوں میں گویا کوئی مقناطیسی قوت بھری ہو۔ قد بھی اچھا تھا۔ کھلے بال جب ہوا کے دوش پر لہراتے تو نہ جانے کتنے دلوں پر بجلی گرتی۔ گاؤں میں آشا کے چرچے ہونے لگے تھے۔ گاؤں کے آوارہ لڑکے اسے دیکھ کر آہیں بھرتے۔ لیکن مجال ہے کسی کی جو اس سے کچھ کہہ دے۔ آشا مضبوط قوت

ارادی کی لڑکی تھی۔ وہ ہمیشہ ظلم کے خلاف لڑنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ کوئی اس کو چھیڑنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ وہ کئی منچلوں کو سبق سکھا چکی تھی۔ بچپن سے جوانی تک بہت سے واقعات تھے جب آشا نے دوسروں کی مدد کی۔ لڑکیوں کو لڑکوں سے بچانا اور دبے کچلوں کی مدد کرنا، اس کا شوق تھا۔ وہ کبھی کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔ ایک بار وہ اسکول سے لوٹ رہی تھی۔ اس نے دیکھا راستے میں گاؤں کے دو آوارہ لڑکے، اس کی چچازاد بہن مینا کو پریشان کر رہے تھے۔ آشا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ ان لڑکوں میں سے ایک سے بھڑ گئی۔ اس نے اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ دوسرا لڑکا بھیڑ جمع ہوتے دیکھ رفو چکر ہو لیا تھا۔

شربتی کو بیٹی کی جوانی سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی زمانہ کتنا خراب ہے۔ دوسرے نچلے ذات کی عورتوں اور لڑکیوں کو تو لوگ مالِ مفت سمجھتے ہیں۔ اسے اپنی جوانی یاد آ گئی تھی۔ جب وہ جوانی کی دہلیز پر تھی تو گاؤں کے پردھان کے بیٹے کی نظر اس پر پڑی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے پیچھے پیچھے رہا کرتا۔ شربتی، پردھان کے گھر کام کاج کے لیے جاتی تھی۔ اپنا بہت خیال رکھتی لیکن طاقت کے آگے سب بے سود ہوتا ہے۔ پردھان کے بیٹے نے ایک دن اس کا منہ دبا کر اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ وہ روتی رہی اور اس کی قسمت اس پر ہنستی رہی۔ طاقت کے نشے نے اس کے چپے چپے پر تباہی مچائی تھی۔ اسے تو کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ ہوش آنے پر وہ بے سدھ سی پڑی تھی۔ پردھان کا لڑکا سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''کسی سے کہا تو تجھے اور تیرے خاندان کو خاک میں ملا دوں گا۔''

اور شربتی نے اس معاملے کو اپنے گناہ کی طرح چھپا لیا تھا۔ اسے پتہ تھا پردھان اور اس کے بیٹے کتنے طاقت ور ہیں۔ کچھ مہینوں بعد اس کی شادی ماتا دین سے ہوئی تو وہ مُرسینا گاؤں سے فراد پور آ گئی تھی۔ غریبی، بے بسی اور بے غیرتی اس سے چمٹی یوں چلی آئی تھیں گویا وہ اس کے جہیز کا حصہ ہوں۔ ماتا دین کے گھر کے لوگ بھی مزدور پیشہ تھے اور مکھیا گری راج کے یہاں کام کرتے تھے۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی شربتی کو بھی مکھیا کے گھر کام

کالج کے لیے جانا پڑا۔ نیا ہمیشہ نیا ہوتا ہے، وہ بھی نئی نویلی دلہن ہی تو تھی۔ اس پر بھی دلکشی سوار تھی۔ جوبن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ مکھیا نے اسے دیکھا، تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ماتا دین تیری جورو تو بڑی شاندار لگے ہے۔ تو نے بتایا نہیں تیرا، وواہ کب ہوا؟''

ماتا دین شرماتا ہوا اپنے اندر سمایا جا رہا تھا

''جی سرکار، بس پچھلے ہفتے ہی تو ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے آج رات اسے یہیں چھوڑ دو۔ مالکن کی خدمت کے لیے۔''

ماتا دین نے تو روبوٹ کی طرح ہر حکم پر سر ہلانا سیکھا تھا۔ کیا کرتا۔ شربتی اسے التجا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر سب بے سود تھا۔

اور اس رات مالکن کے بجائے، اسے مالک کی خدمت کرنی پڑی۔ غم، غصہ اور جنون اس کے اندر ابال مار رہا تھا۔ پر کیا کرتی۔ بڑے لوگوں سے ٹکرانا، خود ریزہ ریزہ ہو جانا ہے۔ یہ تو دنیا میں نہ جانے کب سے چلے آ رہے سلسلے ہیں، غریب بے چارہ مجبور و بے کس ہوتا ہے۔ صحیح کہا ہے کہ غریب کی جورو سب کی جورو ہوتی ہے۔ صبح جب وہ گھر پہنچی تو ماتا دین نے پوچھا۔

''مالکن کی کھدمت کی نا تم نے۔''

''ہاں مالک نے خوب کھدمت لی۔''

بے چارہ ماتا دین سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھ بن گیا تھا کہ یہی چارہ تھا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ مالک کی خدمت کیا ہوتی ہے۔ مالکن کی خدمت تو بہانا ہوتا ہے۔ مکھیا اس سے قبل بھی اس کی برادری کی کئی بہوؤں، بیٹیوں سے خدمت لے چکا تھا۔ ماتا دین کے دل میں کبھی کبھی بہت جوش آتا۔ غصے کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ جی چاہتا مکھیا کے ہزاروں ٹکڑے کر دے اور باہر میدان میں چیل کوؤں کے آگے ڈال دے۔

وقت دبے قدموں پرواز کرتا رہا۔ شربتی ایک بچی کی ماں بنی۔ بچی کا نام آشا رکھا۔

آشا تھی تو سانولی لیکن چہرہ بہت دلکش تھا۔ آشا، ماتا دین، بابا طوطا رام اور شربتی کے کاندھوں، کاندھوں بڑی ہوتی گئی۔ شروع شروع میں اسے تتلاہٹ نے کافی پریشان کیا بعد میں وہ بھی گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہوگئی۔

آشا جب سولہ سال کی ہوئی تو اس کی جوانی کے چرچے گاؤں میں پھیل گئے تھے۔ اس نے دسویں کا امتحان بھی پاس کرلیا تھا۔ پر اب آگے کی پڑھائی کی بات تھی۔ آشا چاہتی تھی آگے پڑھے۔ لیکن ماتا دین اس کا بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران یہ ہوا کہ گاؤں کے پنڈت مدن شرما کا لڑکا چندر موہن اس کی طرف بڑھنے لگا۔ آشا کا دل بھی چندر موہن کے لیے دھڑکنے لگا۔ دونوں اسکول، گھر، کھیت، کھلیان میں چھپے چوری ملنے لگے۔

''آشا۔''

''ہوں۔''

''تم بہت خوبصورت ہو۔''

''جھوٹے....... '' مجھے پتہ ہے میں کتنی خوبصورت ہوں۔'' آشا چندر موہن کو ٹکا سا جواب دیتی۔

''آشا، خوبصورتی صرف رنگ کی نہیں ہوتی۔ خوبصورتی من کی ہوتی ہے۔ پھر رنگ ہے ہی کیا، اصل تو نین نقش ہوتے ہیں، بناوٹ ہوتی ہے، روپ ہوتا ہے اور اس میں تم لاجواب ہو۔ پھر تمہارا نام، لاکھوں کروڑوں میں ایک ہے۔'' چندر موہن حسن کے دریا پر تعریفات کا پل بنا رہا تھا۔

''اچھا۔ کیا ہے میرے نام میں۔'' آشا مزے لیتی ہوئی بولی۔

''آشا۔ یعنی امید، بھروسہ، قرار۔ ایک ایسی امید تمہارے نام میں چھپی ہے کہ ناامیدی رفو چکر ہو جاتی ہیں۔ جگ کی آشا ہو تم۔ نراشا کے اندھیارے میں ایک کرن ہو تم، ایک روشنی ہو، نراش لوگوں کے لیے۔ جہاں ناکامی اپنے جھنڈے گاڑ دیتی ہے، جہاں کوئی

راستہ نظر نہیں آتا وہاں تم ایک روشنی بن کر آتی ہو۔ تم سنسار کی ناکامی، نامرادی، مایوسی، ناامیدی اور کم ہمتی کے لیے راستہ بن جاتی ہو۔ آشا یعنی نراشا کے ایک یگ کا خاتمہ۔ آشا یعنی نئے یگ کی شروعات۔ حوصلہ، ہمت، جرائت، بھروسہ، اعتماد ہو تم۔

''اچھا بابا بس کرو........تم تو کویتا لکھنے لگے۔''

اور پھر دو بے چین روحیں، فاصلے برداشت نہ کر سکیں۔ ان کے اس وصال سے موسم تبدیل ہو گیا، ہوا مہک گئی۔ چرند پرند مست ہو کر جھومنے لگے۔

مکھیا کی بیٹھک پر مجمع لگا تھا۔ ایک تازہ مسئلہ زیر بحث تھا۔

''مکھیا جی۔ ماتا دین کی لونڈیا اور پنڈت مدن کے لونڈے میں جبر دست اشک چل رو ہے'' گاؤں کے ایک ادھیڑ کنور سین نے بتایا۔

''اوہ! یہ تو بڑی اچھی بات ہے........لونڈیا کے پر نکل آئے ہیں۔''

''سرکار دونوں اکثر ادھر ادھر دکھائی دے ویں ہیں۔ ہاتھن میں ہاتھ ڈالے گھومتے رے ویں۔''

''جاؤ ماتا دین کو بلا لاؤ.........'' مکھیا کے حکم پر اس کے مشٹنڈوں میں سے ایک، ماتا دین کے گھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ماتا دین ہاتھ جوڑے حاضر تھا۔

''ہاں بھئی ماتا دین، ہم کیا سن رہے ہیں، تیری لونڈیا پنڈت کے لڑکے سے عشق لڑا رہی ہے۔''

''سرکار ہم سمجھا دیں گے اسے......''

''ہاں اسے سمجھا دے..........ورنہ تو ہمیں جانتا ہے۔''

''جی سرکار.........''

ماتا دین نے گھر آ کر شربتی کو سب کچھ بتایا۔ شربتی دونوں کے معاملات سے واقف تھی۔ اسے چندر موہن اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ معاملے کے انجام سے بھی ڈرتی تھی۔ اس

نے کئی بار آشا کو سمجھایا تھا۔

''آشا۔ اری آشا۔ یو کام چھوڑ دے، یا میں توئے کچھ نا ملے گو۔ بدنامی ہی ہوے گی۔''

''ماں، چندر موہن کچھ دن بعد باہر پڑھنے چلا جائے گا۔ میں بھی چلی جاؤں گی۔ پھر ہمارا ہر خواب پورا ہوگا۔''

آشا کے حوصلوں کے آگے شربتی جھک جاتی تھی۔ وہ چندر موہن سے بھی بات کر چکی تھی۔ چندر موہن اٹل تھا۔ وہ تو سماج سے لڑ جانے کو بھی تیار تھا۔ شربتی نے مکھیا والی بات بھی دونوں کو بتا دی تھی۔ دونوں نے جلد ہی گاؤں چھوڑنے اور شہر جا کر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ آشا اور چندر موہن گاؤں کے باہر کھیت میں کی ڈول پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مکا، جوار اور باجرے کے کھیت اب بھرے بھرے لگنے لگے تھے۔ پورے علاقے میں ایک خوشبو سی پھیلی ہوئی تھی۔ موسم سہانا تھا۔ گرمی رخصت ہو رہی تھی اور برسات کی آمد آمد تھی۔ دو ایک بار بارش ہو چکی تھی۔ آسمان پر بادل کے چھوٹے موٹے ٹکڑے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ چاند آسمان میں روشن ہونے کی تیاری کر رہا تھا، چندر موہن آشا کے پاس تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا گویا چندر موہن چاند ہے اور وہ چاندنی اور وہ سارے سنسار پر چھائی ہوئی ہے۔ سب کو دودھیا کر رہی ہے۔ وہ چندر موہن کو پا کر بہت خوش تھی۔ اس کی اندھیری زندگی میں چندر نے جو چاندنی پھیلائی تھی، وہ اسے منور اور مخمور کیے ہوئے تھی۔ ڈھلتی سہانی شام کا مدھم ہوتا اجالا رات سے گلے مل رہا تھا۔ پرندے اپنے ٹھکانوں کی جانب لوٹ چکے تھے۔ ہوا بھی رکی رکی سی تھی۔ کھیتوں پر خاموشی کی ایک چادر سی بچھی تھی۔ گاؤں کے راستے پر اکا دکا بیل گاڑی اور کسان آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ چندر موہن آج زیادہ ہی رومانی ہو رہا تھا۔

''آشا آؤ، اپنے چاند میں سما جاؤ''

اور آشا نے، نہیں چاندنی نے، خود کو چاند میں سمو دیا تھا۔ ابھی کوئی پل ہی گذرا ہو گا کہ اچانک منظر بدل گیا۔ ایک برق رفتار گاڑی وہاں آکر رکی۔ بریک کی آواز نے سناٹے کے چہرے پر تھپٹر رسید کر دیا تھا۔ گاڑی میں سے چار پانچ ہٹے کٹے غنڈے اترے اور عجیب تیوروں سے دونوں کی جانب بڑھنے لگے۔ چندر موہن اور آشا کی زندگی پر اچانک سیاہ اور کثیف بادلوں کے سائے لہرانے لگے۔ دونوں نے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ لوگ قریب آئے تو پتہ چلا ان میں دو مکھیا کے بیٹے اور باقی ان کے ساتھی تھے۔ وہ دونوں خطرے کے پیشِ نظر ایک طرف کو بھاگنے لگے لیکن وہ کہتے ہیں نا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ان لوگوں نے دونوں کو گھیر لیا۔ دو تو چندر موہن پر ایسے جھپٹے، جیسے چیل اپنے شکار پر لپکتی ہے، دونوں نے چندر موہن کو لاتوں اور گھونسوں کی زد پر لے لیا۔ اس سے قبل کہ آشا کی چیخیں خاموشی کا قتل کرتیں، باقی لڑکوں نے آشا کو دبوچ کر اس کا منہ دبا دیا اور دگڑے دور ایک گنے کے کھیت کی طرف لے گئے۔ چندر موہن کو بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر وہ دونوں بھی مشن میں شامل ہو گئے۔ آشا آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے پوری طاقت لگا کر ایک لڑکے کے لات ماری۔ دوسرے کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ کچھ دور بھاگی بھی، مگر تعداد پھر بھی اہم ہوتی ہے اور پھر مرد کے مقابلے صنفِ نازک۔ یعنی بھیڑیوں کے نرغے میں بکری، آشا بھی مشٹنڈوں کے گھونسوں اور تھپڑوں کے آگے زیر ہو گئی تھی اور پھر چاروں پانچوں نے آشا کی آشاؤں کو نراشا میں بدلنا شروع کر دیا۔ درد و کرب کی تاب نہ لاتے ہوئے، بالآخر وہ بے ہوش ہو گئی۔ غنڈوں کی پارٹی جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔ کافی دیر بعد کسی کسان نے انہیں نیم مردہ حالت میں دیکھ کر شور مچانا شروع کیا۔ سارا گاؤں، کھیتوں کی طرف دوڑ پڑا۔ ماتا دین اور شربتی کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ آشا مردہ حالت میں بے سدھ سی پڑی تھی۔ کچھ ہی دوری پر پنڈت مدن شرما کا لڑکا چندر موہن بھی زخم خوردہ، مردہ سا پڑا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے دونوں کو گاڑی میں ڈال کر شہر کے سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیا۔ پولیس بھی

حرکت میں آ گئی تھی۔ شربتی کو ہوش نہیں تھا۔ اس کا سب کچھ خاک میں مل گیا تھا۔ ہوش آنے پر اس نے پولیس چوکی پر رپورٹ لکھوادی تھی۔ رپورٹ تو بے نام تھی۔ لیکن سب کو شک بلکہ یقین تھا کہ یہ کام مکھیا کے بیٹوں کا ہی ہے۔ پولیس نے چھان بین شروع کردی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ پولیس کپتان پچھلے ہفتے ہی بدلا تھا۔ اس نے سارے تھانوں کی پولیس کو ٹائٹ کردیا تھا۔ معاملہ دبانے کی بھی کوششیں جاری تھیں۔ لیکن بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ اگلے دن اخبارات کی سرخی پر بھی آشا کے زخم اور چندر موہن کے خون کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ مکھیا اور اس کے بیٹے گھر چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ پولیس نے دن رات محنت کر کے ایک مجرم کو گرفتار کرلیا تھا۔ اس نے تھرڈ ڈگری سے گذرتے ہوئے سب کچھ بتا دیا تھا کہ کس طرح مکھیا اور اس کے بیٹوں نے آشا کے ساتھ اس گھنونے کھیل کا منصوبہ بنایا تھا۔

شربتی اتنی ٹوٹ چکی تھی کہ اب کچھ بچا نہیں تھا۔ آشا زیر علاج تھی۔ شربتی نے ٹھان لیا تھا کہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے گی۔ وہ اپنی لڑائی لڑ رہی تھی۔ گاؤں کے اس کی برادری کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ سب ایک ہو گئے تھے آس پاس کے گاؤں کے دلت بھی ساتھ آ گئے تھے اور ایک طاقت بن چکے تھے۔ آہستہ آہستہ معاملہ تحریک بنتا جا رہا تھا۔ پولیس پر دباؤ بڑھنے لگا تھا اور پھر ایک دن سارے مجرم گرفتار ہو کر جیل چلے گئے تھے۔

ادھر آشا اور چندر موہن صحت یاب ہو کر شہر ہی میں پڑھنے لگے تھے۔ آشا نے گرلز کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور ہوسٹل میں رہنے لگی تھی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ پہلے وہ تعلیم حاصل کرے گی پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو کر سماج میں پھیلے درندوں سے لڑے گی۔ چندر موہن نے انجینئرنگ کالج جوائن کرلیا تھا۔ دونوں کی کبھی کبھار ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ مکھیا کے تیور ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ اس نے ماتا دین اور شربتی پر سمجھوتے کا دباؤ بنایا۔ لالچ بھی دیا۔ جب کوئی ترکیب کام نہ آئی تو دھمکیاں دیں۔ یہی نہیں ایک بار عدالت میں

تاریخ کے وقت شربتی پر قاتلانہ حملہ بھی کروایا گیا۔ وہ تو شربتی کی زندگی تھی، جو وہ بچ گئی۔

وقت مسکراتا ہوا فراد پور سے گذرتا گیا۔ آشا نے گریجویشن کر لیا تھا، بی ایڈ بھی مکمل کر چکی تھی۔ اسی دوران پردھانی کے الیکشن آ گئے۔ فراد پور گاؤں ایس سی ایس ٹی کے لیے ریزرو کر دیا گیا تھا۔

ماتا دین کی برادری کے لوگوں نے میٹنگ کی۔

''بھئی ....اب بہت ہو گیو، اب اور اپمان نہیں سہن گے۔ چناؤ سر پر ہیں۔ سیٹ بھی ریجر وہو گئی ہے۔ ہمیں اپنا امیدوار کھڑو کرنو ہے۔ مشورہ دو کسے کھڑو کریں۔''

بابا لکھی رام نے برادری کی میٹنگ میں جب شروعات کی تو سب میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ کئی نام آئے پر اتفاق نہیں ہو پایا۔

''کوئی پڑھا نام ہو____'' دھرم جاٹو بولا

''ارے، آشا کو کھڑا کر دیو۔ او پڑھی لکھی بھی ہے__'' ایک رائے آئی۔

''ہاں! ہاں!'' ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

''پر وہ تو شہر میں ہے۔ کیا وہ مان جاوے گی'' ایک آواز ابھری۔

''ہاں! کوں نا؟ ہم منالن گے اسے'' ایک بزرگ نے بات سنبھالی۔

آشا کے سامنے جب بات آئی تو اس نے بہت غور کیا۔ اسے لگا اب اس کے مشن کا صحیح وقت آ گیا ہے۔ اس نے برادری والوں کو مایوس نہیں کیا۔ فراد پور گاؤں میں تقریباً دو ہزار ووٹ تھے۔ سات سو سے زیادہ دلت ووٹ تھے جب کہ برہمن، پنڈت، گوجر ووٹ بھی آٹھ سو کے آس پاس تھے۔ مسلمان بھی ایک آدھ سو تھے۔ مالی، کمہار اور گڑریے۔ سب ملا کر دو ہزار بائیس ووٹ بنتے تھے۔ مکھیا کے زیر اثر برہمن، پنڈت اور گوجر تو تھے ہی۔ رعب داب کی وجہ سے مالی گوجر، کمہار اور مسلمان بھی اسے ووٹ دیتے تھے۔ پر اس بر نقشہ بدل چکا تھا۔ دلتوں کے ساتھ مسلمان بھی آ گئے تھے۔ مالی، کمہار بھی مکھیا سے پریشان

تھے۔ گوجر اور پنڈت برادری کے کچھ لوگ اندر اندر مکھیا کو ہرانا چاہتے تھے۔ گاؤں میں دو ہی امیدوار کھڑے ہوئے۔ مکھیا نے لالچ دے کر ایک دلت کو توڑ لیا تھا۔ مکھیا نے اپنے امیدوار کے لیے بہت کوششیں کیں، بڑی زور آزمائی ہوتی رہی۔ الیکشن کے دن خون خرابے کے بھی مواقع تھے لیکن چپے چپے پر موجود پولیس نے حالات پر قابو رکھا۔ ریزلٹ آتے ہی آشا کا پرچم بلند ہو گیا تھا۔ مکھیا کے ارمانوں اور آشاؤں کو آشا نے نراشا کے اندھیرے میں بدل دیا تھا۔ اب سیاسی طاقت پسماندہ لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ریاست میں بھی، اقتدار میں تبدیلی ہوئی تھی اور دلت حمایت والی سرکار، حکومت میں آ گئی تھی۔

شربتی، ماتا دین اور اس کی برادری کے لوگوں میں نیا جوش آ گیا تھا۔ دوسری طرف مقدمات میں الجھتے الجھتے مکھیا گری راج کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ پہلے بیٹوں اور اس کے ساتھیوں کو عمر قید ہوئی پھر زمینیں بکنی شروع ہو گئیں۔ دن بہ دن مکھیا کا گراف تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔

آشا نے گاؤں کو ہر طرح سے سدھارنے کی کوشش کی تھی۔ اسکول کو خوب فروغ دیا۔ لڑکیوں کا الگ سے ایک اسکول بھی بنوایا۔ علاج وغیرہ کے لئے ایک ڈسپنسری بھی کھل گئی تھی۔ گاؤں سے شہر تک آٹو رکشہ چلنے لگے تھے۔ فراد پور آس پاس کے ضلعوں میں بھی مشہور ہو گیا تھا۔ لوگ اسے 'آشا والا گاؤں' کے نام سے پہچانتے تھے۔ بہت دنوں بعد، ایک دن آشا کی چندر موہن سے ملاقات ہوئی۔ چندر موہن بولا۔

"آشا! تم آج بھی آشا بن کر سب کو موہ رہی ہو۔"

"شاعری نہیں کرو، یہ بتاؤ یہ چاند آج کل کس کے آنگن میں چمک رہا ہے۔"

"کہیں نہیں۔ اسے آج بھی آنگن کی تلاش ہے۔ اور اسی تلاش میں چاند، اپنی چاندنی تک آیا ہے۔"

"اوہ یہ بات ہے۔" آشا کے چہرے پر خوشی کے ہلکے سے سائے تھے۔

''میں اپنے بابا سے مشورہ کروں گی''

''کیوں یہ تو تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔لیکن ہم لوگ ابھی اتنے ایڈوانس نہیں ہیں۔''

اب آشا صرف ماتا دین کی بیٹی نہیں تھی، بلکہ پوری برادری کی بیٹی اور شان تھی ۔گاؤں کی عزت تھی، جس کی شادی برادری کے لئے بہت اہم تھی۔اسی لئے ماتا دین نے برادری کے بزرگوں کے سامنے آشا اور چندر موہن کی شادی کی بات رکھی تو برادری کے لوگوں میں ابال آ گیا تھا۔فوراً ایک میٹنگ رکھی گئی۔ برادری کے ایک بزرگ نے کہا

''آشا ہماری شان ہے۔ آن اور بان ہے وا کی شادی گیر برادری میں کیسے ہوئے گی۔''

سب خاموش ہو گئے تھے۔ایک پڑھے لکھے نوجوان نے کہا۔

''آشا پڑھی لکھی ہے۔شادی میں اس کی مرضی شامل ہونی چاہیے۔''

''پر وہ پورے گاؤں کی اجت بھی ہے۔''

بہت دیر کے بحث ومباحثے کے بعد سب ایک رائے ہو گئے تھے۔

اور آشا کے آکاش پر سیاہ کثیف بادلوں نے چاند اور چاندنی کے درمیان ہمیشہ کے لئے پردہ کر دیا تھا۔

□□□

ایک ادھوری کہانی

''پھر یوں ہوکہ اچانک شہزادہ غائب ہوگیا۔۔۔''

شادمانی بیگم سانس لینے کو رکیں تو بچوں کے سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

''نانی آپا! ایسا کیسے ہوگیا۔۔؟'' ریحان کا تجسس اس کی زبان پر آگیا۔

''دادی آپا! شہزادہ کہاں چلا گیا؟ کیا پری اسے لے گئی؟'' سمیہ کی حیرانی بڑھ گئی تھی۔

''کیا وہ اب کبھی نہیں آئے گا'' حمیرا نے بھی اپنا سوال چھوڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑے بیگم شادمانی کو دیکھ رہی تھی۔ سبحان اور حیا بھی گم صم سے بیٹھے تھے۔

بیگم شادمانی اپنے پوتے۔ پوتیوں، نواسے۔ نواسیوں کے درمیان گھری بیٹھی تھیں۔ بچے ان سے ضد کر کے کہانی سن رہے تھے۔ بیگم شادمانی کہانی سنانے میں ماہر تھیں۔ بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ وہ جب بھی رات کو نماز اور کھانے سے فارغ ہوکر اپنے بستر میں جاتیں، بچے ایک ایک کر کے ان کے بستر میں آدھمکتے۔ بیگم شادمانی بچوں کو راجا۔ رانی، دیو۔ جن، پری، شہزادہ۔ شہزادی کی دلچسپ کہانیاں سناتیں اور بچے بڑے انہماک سے سنتے۔ بعض بچے تو سنتے سنتے نیند کی گودی میں چلے جاتے۔ بعض کو نیند کے جھونکے آتے رہتے، مگر وہاں سے جانے کو راضی نہ ہوتے۔ دیر رات ان کی مائیں اپنے بچوں کو اپنے کمروں اور بستروں میں لے جاتیں۔ اکثر بیگم شادمانی سے کہانی سننے کے بعد ہی بچوں کو نیند آتی۔ انہیں زیادہ تر لوگ شادمانی آپا کہتے۔ 'آپا' ان کے نام کے ساتھ ایسا جڑا گویا ان کی کنیت ہو۔ کیا بچے، کیا بڑے، سبھی انہیں آپا کہتے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ کوئی انہیں شادمانی آپا کہتا،

تو کوئی انہیں پھوپھی آپا، پوتے۔ پوتیاں، نواسے۔نواسیاں تو انہیں نانی آپا اور دادی آپا کہتے۔ ابھی کل ہی تو وہ ایک دلچسپ کہانی سنا رہی تھیں کہ ان کی لاڈلی پوتی سمیہ، جو چھ سال کی تھی ضد کرنے لگی۔

''دادی آپا، دادی آپا، ہمیں سچی کہانی سناؤ نا! ہمیں سچ مچ کی کہانی سننی ہے۔''

پوتی کے منہ سے یہ سن کر شادمانی بیگم لمحہ بھر کو چونک گئی تھیں۔ وہ ماضی جو وہ بھول گئی تھیں اور جسے یاد کرنے کی نہ ہمت تھی نہ ضرورت۔ بچی کی فرمائش پر پہلے تو انہوں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''بیٹا سچی کہانی پھر کبھی، میں تمہیں 'سارا' پری کی کہانی سناتی ہوں''

''نہیں دادی آپا! ہم نہیں سنتے۔'' سمیہ نے اس طرح منہ بنایا اور دوسری طرف گھوم گئی، گویا ناراض ہوگئی ہو۔ کتنی پٹاخہ تھی، شیطان کی نانی کہیں کی۔

''نانی آپا! ہم تو سچی کہانی سنیں گے بس'' ریحان نے معاملے کو اور الجھا دیا۔

''اچھا میں کل سناؤں گی......'' بیگم شادمانی نے پھر ٹالنے کی کوشش کی۔

''او کے نانی آپا......'' ریحان بولا۔

''میری پیاری نانی آپا.....'' حمیرہ نے بھی ساتھ دیا۔ حنا تو لپک کر ان کی گود میں بیٹھ گئی۔

اس دن تو بات ٹل گئی تھی۔ لیکن بچے کہاں ماننے والے تھے۔ انہوں نے بیگم شادمانی کو اگلے دن وقت مقررہ پر پکڑ ہی لیا۔ بیگم شادمانی بمشکل تمام اس سخت مرحلے کے لئے تیار ہوئیں۔

''اچھا تو لو سنو۔۔ میں تمھیں ایک شہزادے کی، سچ مچ کے شہزادے کی کہانی سناتی ہوں۔۔۔ ایک تھا شہزادہ تھا، واقعی شہزادہ تھا وہ، وہ رنگ میں تو سانولا تھا مگر ذہن اور عقل وفہم میں، اخلاق و کردار میں، خدا ترسی میں، غریب پروری میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے پردادا انگریزوں کے زمانے میں ایس پی تھے۔ ان کی انگریزوں سے خوب چھنتی تھی۔''

''دادی، یہ چھنتی، کیا ہوتا ہے؟''

سمیہ نے بیچ میں ٹوک دیا۔ معصوم سے سوال پر بیگم شادمانی کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور سمیہ کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

''چھنتی کا مطلب...... ہوتا ہے۔ دوستی ہونا، سمجھیں؟''

''انگریز تو انگریزی بولتے ہوں گے پھر وہ کیسے سمجھتے ہوں گے؟'' سبحان بھی بول پڑا۔

''ارے بھیا، ان کے پردادا بھی انگریزی جانتے تھے اور انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔''

''اچھا سنو! وہ شہزادہ ریاست دولت پور کا رہنے والا تھا۔ دولت پور بہت بڑا قصبہ تھا۔ اور سیدوں کا قصبہ کہلاتا تھا۔ وہاں زیادہ تر سید آباد تھے۔ اور سب کے سب رئیس تھے۔ دولت پور باغات کے لئے مشہور تھا۔ آم کے باغات میں دسہری، لنگڑا، گلاب جامن ، چوسا اور رٹول کی فصل ہوتی۔ آم کے علاوہ لیچی اور امرود کے باغات بھی تھے۔ دولت پور کے نچلے طبقے کے لوگ اور غریب مزدور باغات میں محنت مزدوری کرتے۔ باغات کے علاوہ کھیتی باڑی بھی ہوتی۔ سال میں دو بار فصلیں اگاتے۔ گیہوں، چاول اور مکا کے علاوہ یہ علاقہ گنّے کے لئے بھی مشہور تھا چھوٹے بڑے ہر طرح کے کسان تھے۔ کچھ تو خود اپنی کھیتی کرتے۔ زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ امیروں اور رئیسوں کے باغات اور کھیتوں میں کام کرتے۔ باغات کی فصل کا جب موسم آتا تو علاقے کی رونق دیکھنے لائق ہوتی۔ ہر طرف آم ہی آم۔ باغ کے ٹھیکے دو سال کے لئے چھوڑ جاتے۔ ٹھیکے میں سو پچاس پیٹی آم مالک کو الگ سے ملتے۔ جن کا استعمال اکثر لوگ سرکاری افسروں اور دوست احباب کے یہاں تحفے بھیجنے میں کرتے۔ اس طرح جاڑوں کے موسم میں جب گنّے کا موسم ہوتا تو پورے علاقے کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ زیادہ تر کسان اپنا گنا، چینی ملوں میں لے جاتے وہاں سے پرچی ملتی، پرچی سے بعد میں بینکوں سے پیسے مل جاتے۔ بہت سے کسانوں نے کولہو بھی لگا رکھے تھے۔ کولہوؤں پر گنّے سے گڑ تیار کیا جاتا۔ جب گڑ کڑھاؤ میں کھولتا تو اس کی میٹھی میٹھی خوشبو سے پورا

علاقہ معطر ہو جاتا۔

میں جس شہزادے کی کہانی تمہیں سُنا رہی ہوں ۔اس کا گھر اور اس کا خاندان دولت پور کے پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری عہدوں کی وجہ سے بڑے بڑے دولت مندوں سے زیادہ مشہور تھا۔

''بچو پتہ ہے اس شہزادے کا نام کیا تھا۔؟''

''نہیں نہیں۔آپ بتاؤ نا!'' ایک ساتھ سبھی بول پڑے

''اس کا نام سید قمر الدین تھا۔قمر یعنی چاند، واقعی وہ شہزادہ پورے علاقے میں چاند جیسا ہی تھا۔ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ اس کے پردادا سید عبد الحئ انگریزوں کے دوست تھے۔اور ضلع کے ایس پی تھے۔انگریز اکثر ان کے گھر مہمان ہوتے۔جب بھی انگریز آتے ۔عبد الحئ کے گھر دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔سفید چٹے اور سرخ سفید رنگت والے انگریزوں کو لوگ یوں دیکھتے گویا سیاروں سے نئی مخلوق دنیا میں آگئی ہو۔انگریز دن میں وسیع وعریض دالانوں میں آرام فرماتے۔ان کے آرام کے لئے نوکر چاکروں کی پوری ٹیم لگی ہوئی تھی۔مشروب آرہے ہیں۔کھانے کی انواع واقسام حاضر ہیں۔انگریز ویسے تو سگار کے شوقین تھے لیکن دولت پور آکر انہیں حقہ اتنا پسند آیا کہ انہیں اس کی لت لگ گئی تھی ۔ ہر دم حقہ تازہ کیا جاتا۔چلم بھری جاتی رہتی اور انگریز خوبصورت چادر بچھی چارپائیوں اور نواڑ کے پلنگوں پر لیٹے اور بیٹھے حقے کی لمبی سی نے ،منہ میں دبائے حقہ گڑ گڑاتے رہتے۔انہیں حقے کا گڑ گڑانا بہت اچھا لگتا تھا۔انگریز جب ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بولتے تو گاؤں اور قصبے کے لوگ ہنسا کرتے۔

''او مین! ٹم کیا کرٹا۔۔''

''ٹم وہائی ،ہنسٹا۔۔''

اور لوگوں کے پیٹوں میں ہنستے ہنستے بل پڑ جاتے۔رات کو عبد الحئ انگریزوں کو شکار پر لے جاتے۔ گھنے جنگلوں میں بارہ سنگھا، ہرن، نیلا، سانبھر، پہاڑا اور کبھی کبھی تیندوے

کا بھی شکار ہو جاتا۔ انگریزوں کی بندوقیں بہت اچھی تھیں۔ ایک بھی فائر نشانے پر لگتا تو جانور ڈھیر ہو جاتا تھا۔ جانور کے گرتے ہی ملازمین جا کر ایکلال کرتے اور گوشت بناتے۔ انگریزوں کو گوشت کا بڑا شوق تھا۔ وہ بھنا ہوا گوشت اور کباب بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ شکار کے جانوروں کی کھال سکھائی جاتی، پھر اس میں دوائیاں اور مسالے لگائے جاتے، بعد میں ان میں بھس اور دوسری ہلکی چیزیں بھر کر ایسا بنا دیا جاتا گویا دوبارہ زندہ ہو اٹھے ہوں۔ پورا جانور، جانوروں کے سر، اور ان کی کھالوں کو مہمان خانے کے بیچ میں، دیواروں پر اور کونوں میں سجایا جاتا۔ مہمان خانے میں داخل ہوتے ہی بعض لوگ تو ڈر ہی جاتے۔ ان سے کیا رعب قائم ہوتا تھا، کیا شان ٹپکتی تھی۔ شکار، دولت پور کے زیادہ تر سیدوں کا شوق بھی تھا اور کمزوری بھی۔

شہزادہ قمرالدین کے دادا سید نجم الدین اپنے وقت کے بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ دولت پور اور آس پاس کے لوگوں کا علاج کرتے۔ پھر جب جنگِ آزادی کی لڑائی میں گاندھی جی نے 'عدم تعاون' تحریک چلائی تو سید نجم الدین بھی اس تحریک میں شریک ہو گئے۔

''دادی، دادی، یہ عدم تعاون تحریک کیا ہے؟'' حمیرا نے اپنا تجسس ظاہر کیا

بیگم شادمانی مسکرائیں۔ اور بولیں۔

''بچو تمہیں یہ تو پتہ ہے کہ ہمارے ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا؟''

''جی ! دادی''

''انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ہمارے لیڈروں نے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں۔ انہیں میں سے ایک تحریک جو گاندھی جی نے چلائی تھی، اس کا نام عدم تعاون تحریک ہے۔ عدم تعاون یعنی ہم کسی کام میں اب آپ کی مدد نہیں کریں گے۔ جب گاندھی جی نے یہ نعرہ دیا تو لوگوں نے سرکاری عہدے چھوڑ دیئے۔ وکیلوں نے وکالت چھوڑ دی۔ سرکار کی مدد کرنے اور اس کی مدد لینا، دونوں کام چھوڑ کر لوگ میدان میں آ گئے۔ بچو،

اس سے آزادی کی لڑائی کو بہت طاقت ملی ۔۔۔ اونہ ۔۔انکھو ۔۔اکھ ۔کھا'' اور بیگم شادمانی کو کھانسی آگئی، کھانسی پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے دوباری کہانی شروع کی

''شہزادہ کے والد بہت بڑے تاجر یعنی بزنس مین تھے۔''

''دادی، جلدی سے شہزادے کے بارے میں بتائیے نا!'' بچوں نے یک زبان کہا۔

''بتاتی ہوں! شہزادہ اپنے گھر کا اکلوتا بیٹا تھا۔اس کے تین بہنیں تھیں ۔بچپن ہی سے شہزادہ بہت ذہین، تیز طرار اور شرارتی تھا۔شہزادہ کی دادی بھی بڑی نیک اور گھریلو خاتون تھیں شہزادہ کی ماں معمولی پڑھی لکھی تھیں ۔مگر انہیں پڑھنے کا خوب شوق تھا۔افسانے اور ناول پڑھنا ان کا جنون تھا۔وہ خود بھی کہانیاں لکھا کرتی تھیں ۔بہت سمجھ دار خاتون تھیں۔ عورتوں کی تعلیم کی حامی تھیں ۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بچپن ہی سے شہزادہ اور اس کی بہنوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا۔شہزادے کو دہلی کی جامعہ میں اور اس کی بہنوں کو علی گڑھ میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ شہزادے نے جامعہ میں خوب نام کمایا۔ ہر طرح کے مقابلوں میں اول آتا۔بیت بازی کا ماہر تھا اور خود بھی شعر کہنے لگا تھا۔اس کی نظمیں تو بڑی پر اثر ہوتی تھیں ۔پھر شعر پڑھنے کا اس کا الگ انداز۔جامعہ سے پڑھنے کے دوران ہی شہزادے کے والد کا انتقال ہو گیا۔شہزادہ مشکل سے پندرہ سال کا ہو گا۔اچانک سر سے سایہ اُٹھ جانے سے شہزادے کو بہت رنج و ملال ہوا۔مگر مرضی الٰہی کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔شہزادے پر اب گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی آ گیا تھا تین تین بہنیں اور ماں ،اب سب کچھ اسے ہی دیکھنا تھا۔اسی لئے اس نے دہلی سے پڑھائی ختم کر کے دولت پور میں ہی پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

کہانی سناتے سناتے بیگم شادمانی نے دیکھا سمیہ سو گئی ہے۔حیا اور سبحان بھی اونگھ رہے ہیں۔باقی بچے بھی کچھ جاگے کچھ سوئے لگ رہے تھے۔

''بچو چلو اب اپنے اپنے بستروں میں جاؤ۔اب کہانی کل ہو گی۔''

بیگم شادمانی کے کہانی بیچ میں روکنے کے فیصلے سے ناراض سبحان، آنکھوں میں نیند لئے وہاں

سے جانے تو لگا مگر جاتے جاتے بولا۔

"نانی آپا! میں نا کل ضرور شہزادے کی آگے کی کہانی سنوں گا"

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ، شب بخیر۔۔۔سب کہئے۔۔شب بخیر۔۔"

"شب بخیر۔۔"

سارے بچے ایک ساتھ بول پڑے۔

بچے جا چکے تھے۔بیگم شادمانی اپنے بستر پر تنہا رہ گئی تھیں۔انہیں یاد آیا آج تو انہوں نے عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی۔گھڑی دیکھی رات کے بارہ بجنے والے تھے۔انہوں نے وضو کیا اور نماز کی چوکی سنبھال لی۔نماز سے فارغ ہونے کے بعد اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔

"اے اللہ تو اُنہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرنا۔اللہ ہم سب کو بخش دینا، میرے بچوں کو نیک راہ پر چلانا۔"

بیگم شادمانی کے ایک بیٹا سید ضیاء الدین اور ایک بیٹی سید صبا قمر تھی۔بیٹی ایک پرائیویٹ کمپنی میں بڑے عہدے پر تھی۔اس کے شوہر سید غفران ایک بڑی کمپنی میں جی ایم تھے۔ان کے دو بچے، سبحان اور حیا تھے۔بیٹا ضیاء میڈیکل کالج میں پروفیسر تھا۔اس کی دو بیٹیاں سمیہ اور حمیرا اور ایک بیٹا ریحان تھا۔سارے بچے چھوٹے تھے۔چار سال سے دس سال تک کے بچے، جب کبھی گرمی کی چھٹیاں ہوتیں، صبا بھی آجاتی اور سارے بچے مل کے گھر سر پر اُٹھا لیتے، ساتھ میں دادی اور نانی یعنی بیگم شادمانی کو بھی ساتھ لئے پھرتے۔بیگم شادمانی پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتیں۔کہانی سنانا ان کا بچپن کا شوق تھا۔جب وہ چھوٹی تھیں تو اپنی دادی اور نانی سے خوب کہانیاں سنتی تھیں۔اور اب جب بزرگی نے اپنا لیا تو کہانیاں سنانا، ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔وہ اپنی دادی۔نانی کی ادھوری کہانیوں کو پورا کرتیں اور دلچسپ انداز میں کہانیاں سنایا کرتیں۔ان کے

شوہر کا انتقال ابھی پانچ چھ سال قبل ہی ہوا تھا۔ بھرا پرا گھر، آندھی میں تنکوں کی طرح بکھر کے رہ گیا تھا۔ بیٹا جاب کے سلسلے میں باہر تھا۔ بیٹی کی شادی ہو چکی تھی، وہ بھی دوسرے شہر میں تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اب ان کا کوئی نہیں تھا۔ یوں تو ان کا میکہ بھی دولت پور میں ہی تھا۔ بھائی، بھابھیاں، والدین، سب تھے مگر ان کی ذاتی تنہائی دور کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اگلے دن شام ہوتے ہی ریحان ان کے آس پاس منڈلانے لگا تھا۔

''بیٹا ابھی جاؤ، کچھ پڑھائی کرلو۔''

سمیہ پڑھائی کی شوقین تھی۔ حنا کو بھی پڑھنا اچھا لگتا تھا، وہ دونوں خود کتابیں لے کر بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ اچانک شور ہوا اور ضیا اور صبا، ان کے بچے وغیرہ سبھی آدھمکے۔ بچوں نے اپنے والدین کو بتا دیا تھا کہ دادی آپا، شہزادے کی سچی کہانی سنا رہی ہیں۔ تو بچے اپنے والدین کو بھی گھسیٹ لائے۔

''امی! ہم بھی سنیں گے کہانی۔۔۔'' ضیا نے جب کہا تو بیگم شادمانی جذباتی ہوگئیں، انہیں اپنے شوہر کی یاد آگئی۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔

''کیوں نہیں بیٹا! آؤ، تم بھی بیٹھ جاؤ۔۔''

''ارے حنا، ذرا امی کے لئے ایک کپ چائے لیتی آنا۔''

ضیاء نے اپنی بیوی کو پکارا۔ حنا چائے لے کر آئی تو خود بھی مجلس میں بیٹھ گئی۔ صبا بھی کاموں سے فارغ ہو کر منڈلی میں شامل ہو چکی تھی۔

''لو سنو! تو بچو ہوا یہ کہ والد کے انتقال کے بعد شہزادے نے سب کچھ سنبھال لیا۔ پڑھائی بھی کرنی اور کاروبار بھی دیکھنا۔۔ کھیتی باڑی، باغات، نوکر چاکر۔۔ سب پر انہوں نے اپنا کنٹرول کر لیا تھا۔ شہزادے کو شکار کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے بچپن ہی میں نشانہ بازی سیکھ لی تھی۔ دراصل دولت پور کے سیدوں میں شکار کے ساتھ ساتھ نشانہ بازی کا بھی

شوق تھا۔ کئی بچے تو نشانہ بازی میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر نام کما چکے تھے۔

اکثر شہزادہ رات کو شکار پر نکل جاتا۔ صبح تک شکار کھیلتے اور کئی جانور شکار کر لاتے۔ ذبح کر کے گوشت پورے محلے میں تقسیم کر دیا جاتا۔ غریبوں کا خاص خیال رکھا جاتا۔ ایک بار کی بات ہے۔ شاد مانی بیگم کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا تھا۔ اور وہ لمحہ بھر کو رک گئیں۔

''کیا ہوا ؟۔ کیا ہوا۔۔ بتائیے نا۔۔''

بچے بڑے سبھی ایک ساتھ بول پڑے۔ شاد مانی بیگم نے کہانی پھر شروع کی۔

''شہزادہ رات میں شکار کھیل رہا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دوست بھی تھے، جو نیپال سے آئے ہوئے تھے، اور ملازمین بھی تھے۔ ایک بارہ سنگھا کے پیچھے جیپ دوڑ رہی تھی۔ خاموش رات۔۔۔ جنگل میں درخت بھی دم سادھے کھڑے تھے۔ ہوا ساکت تھی۔ جیپ دوڑ رہی تھی۔ سرچ لائٹ کافی دور تک اِدھر سے اُدھر رینگ رہی تھی۔ اچانک لائٹس کے سامنے تیندوا آ گیا۔ ڈرائیور مہندر نے زور سے بریک لگائے۔ جیپ کے پہیے چیخ اُٹھے۔ جنگل کی خاموشی کراہ اُٹھی تھی۔ جیپ میں بیٹھے سارے لوگ آگے کی طرف جھک سے گئے تھے۔ تیندوے کو دیکھ کر سبھی خوفزدہ سے تھے۔ شہزادے نے بندوق سنبھالی، نشانہ لگایا اور فائر کر دیا۔ جنگل کی خاموشی اور تیندوا، دونوں نے دم توڑ دیا۔ شہزادہ جیپ سے کود کر تیندوے کی طرف دوڑ پڑا۔ اچانک مردہ تیندوے میں جان پڑ گئی، وہ زخمی حالت میں ہی شہزادے پر جھپٹ پڑا۔ ملازمین اور شہزادے کے نیپالی دوست ہکا بکا سے جیپ میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ شہزادے کی مدد کرتا۔ شہزادہ تیندوے سے متصادم تھا۔ تیندوے کی دہاڑ پورے۔۔۔۔۔ علاقے کو دہلا رہی تھی جیپ میں بیٹھے لوگ تسبیح پڑھ رہے تھے۔ دعا مانگ رہے تھے۔''

بیگم شاد مانی تھوڑی دیر کے لئے چائے لینے کو رک گئیں۔ تو ایک ساتھ سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

''آگے کیا ہوا دادی.....''

''کیا شہزادہ مر گیا......''

''کیا شہزادے کو تیندوے نے کاٹ لیا۔''

''بس کرو۔ میں بتاتی ہوں۔ شہزادے کے ہاتھ میں بندوق ضرور تھی لیکن اس کے کارتوس ختم ہو چکے تھے۔ شہزادہ بہت ہمت والا تھا۔ اس نے بندوق کو لاٹھی کی طرح استعمال کر لیا۔ زخمی تیندوے پر تابڑ توڑ حملے کر دئے۔ کئی وار خاصے سخت تھے۔ تیندوا خطرناک دہاڑوں کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ شہزادہ بھی گر پڑا تھا۔ پیچھے سے ملازمین دوڑے اور زخمی شہزادے کو جیپ میں ڈال کر فوراً اسپتال لے آئے۔

''پھر کیا ہوا ......'' سوال نے پھر ہمت کی۔

''کیا شہزادہ بچ گیا......'' دوسرا سوال بھی قطار میں لگ گیا تھا۔ بچوں اور بڑوں کی بھی آواز بند ہو گئی تھی۔ سبھی رنجیدہ سے ہو گئے تھے۔

''کئی مہینے کے علاج کے بعد شہزادے کے زخم بھر گئے تھے۔ اب وہ پہلے کی طرح صحت مند ہو گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ شہزادے کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اب تو شہزادہ راتوں رات اسٹار بن گیا تھا بس... کہانی ختم...''

''نہیں۔ نہیں کہانی اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئی۔'' حمیرا نے احتجاج درج کیا

''دادی یہ تو چیٹنگ ہے.... ''سمیہ بھی بول پڑی۔ ''ہم تو پوری کہانی سنیں گے۔''

''شہزادے کی شادی ہوئی یا نہیں دادی.......'' بچوں نے اور ساتھ ہی بچوں کے والدین نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔

''اچھا، چلو تم کہتے ہو تو اس کی شادی بھی کر دا دیتے ہیں۔''

بیگم شادمانی یہ کہتے ہوئے ایک عجیب سے جذبے سے معمور ہو گئی تھیں۔ ان کی آواز رندھنے لگی تھی۔

''بچو! شہزادے کی شادی کی کہانی سنو گے؟''

''ہاں۔ سنیں گے....'' سب یک زبان تھے۔

''تو سنو، اس سے قبل کہ شہزادے کی شادی ہو میں تمہیں شہزادے کی ہونے والی بیوی، یعنی شہزادی کی کہانی سناتی ہوں........''

''واہ! ۔اب آئے گا مزہ........ ''ریحان خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔وہ اپنی امی کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔

جس دولت آباد کا میں ذکر کر رہی تھی۔اسی میں سیدوں کا ایک اور باوقار گھرانہ تھا، سید سلیم الدین کا پورے علاقے میں چرچا تھا۔ان کا بڑا رعب داب تھا۔ان کے والد سید اللہ راضی بہت بڑے زمین دار تھے۔ان کے گھر پر ہی عدالت لگا کرتی تھی۔اس خاندان میں پیسہ بھی تھا اور سیاسی قوت بھی۔آس پاس کے علاقے میں شہرت تھی، جب دولت پور میں پنچایتی انتخاب شروع ہوئے تو اسی گھرانے کے لوگ چیرمین چنے گئے۔ نصف صدی سے بھی زائد سے اس گھرانے کے لوگ چیرمین بنتے آئے ہیں۔سید سلیم الدین کے بیٹےسید نسیم الدین کے دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔سید نسیم الدین بہت ملنسار، خوش اخلاق، ماہر سیاست داں اور بڑے زمین دار تھے۔وہ عبادت و ریاضت میں کافی آگے نکل چکے تھے۔ان کی بزرگی کے بھی بہت چرچے تھے۔ان کی سب سے چھوٹی بیٹی شادیہ بے حد خوبصورت تھی۔بارہ۔تیرہ سال کی ہی تھی کہ اس کی خوبصورتی اس قدر نکھری کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔گول مٹول سا چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ، موتی جیسے چمکتے دانت، آنکھیں گویا پیالوں میں سمندر، بوٹا سا قد، بالکل گوری چٹی، ٹھوڑی پر کالا مسہ گویا قدرت نے نظر بد سے بچانے کو ہمیشہ کے لئے لگا دیا ہو۔کالے سیاہ لہراتے بال جیسے برسات کے موسم میں آسمان پر لہراتا بادل کا ٹکڑا۔چال میں پھرتی، ہرن بھی شرما جائے۔کام میں چستی ،وقت خود پر لجائے۔آواز میں مٹھاس اور سریلا پن ایسا جو سنے، سنتا ہی رہ جائے۔وہ واقعی شہزادی تھی۔نہیں دولت پور کی سرزمین پر اُتر آئی ایک پری تھی۔وہ ننھال کی طرف سے بھی بڑے زمین دار سید غلام مصطفی کے خاندان اور ددھیال کی طرف سے بھی نامور خاندان

سے تھی۔ دونوں خاندانوں میں بلکہ پورے دولت پور میں کوئی لڑکی اس کے ہمسر نہیں تھی۔ گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہزادی کو علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی شہزادی نے سب کا دل موہ لیا۔ استانیاں اس کے حسن پر فدا تھیں۔ سہیلیاں اسے دیکھ کے عش عش کرتیں۔

''دادی....... ذرا رکو نا،........ یہ بتاؤ کیا وہ آپ سے بھی خوب صورت تھی؟''

سمیہ نے معصومیت سے ایسا سوال کیا کہ بیگم شادمانی، ایک لمحے تو چکرا کے رہ گئیں۔ پھر سنبھل کر بولیں۔

''سمیہ بیٹا، میں کوئی خوبصورت ہوں۔ میری عمر دیکھو پھر اس کی عمر....... کتنا فرق ہے؟''

سمیہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ بیگم شادمانی ساٹھ کی ہونے کے بعد بھی بہت خوبصورت اور چاق چوبند تھیں۔ ان کے چہرے سے نور ٹپکتا تھا۔ ان کی آنکھیں بہت پرکشش تھیں۔

''اچھا بچو! چلو بس۔۔ اب کہانی یہیں ختم۔۔ پھر کل ملیں گے۔''

''دادی، دادی۔۔'' سمیہ براسا منہ بنا کر بولی۔

''نانی۔۔۔ اور کہونا۔۔۔ شہزادی کے بارے میں اور بتاؤ نا۔۔۔'' حنا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب کل۔۔۔ چلو۔۔ سب اپنے بستروں میں، کل اسکول بھی جانا ہے۔''

اور سب ایک ایک کر کے یوں چلے گئے، جیسے میلے کی دوکانیں اُٹھ گئی ہوں۔ بیگم شادمانی نے نماز چوکی سنبھال لی۔ دیر رات تک عبادت میں مشغول رہیں اور پھر نیند نے انہیں اپنی نرم گرم بانہوں میں چھپالیا۔

انہوں نے دیکھا وہ ایک دکان کے اندر کھڑی ہیں۔

''ذرا وہ سوٹ دکھادیں۔ ہاں وہی ہرے رنگ کا۔''

''یہ کس ریٹ کا ہے؟''

''بہن جی! یہی ہزار روپے کی رینج کا ہے۔آپ کو جو کچھ بھی چاہیے لے لیجیے، مناسب پیسے لگ جائیں گے۔''

''اچھا تو وہ سفید، سیلف والا ، اور وہ، ہلکا نیلا بھی نکال دیں۔ان سب کے پیسے بتا دیں۔''

''بہن جی چار ہزار دو سو ہوتے ہیں،آپ چار ہزار دے دیں۔''

وہ ابھی پیسے گن ہی رہی تھی کہ ایک آواز نے اسے حیران کر دیا۔

''میرے لئے بھی ایک شرٹ لے لو۔۔''

یہ آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ابھی ایک حیرت سے پردہ اُٹھا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے دیکھا، ضیار کے ابو دوکان میں داخل ہو رہے ہیں۔وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔وہ مبہوت سی انہیں دیکھے جا رہی تھی کہ اچانک وہ باہر کی طرف چلے گئے۔دکان دار کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''بہن جی! یہ بل ہے آپ کا''

دوکاندار نے بل اور لفافے تھما دئے تھے،وہ جلدی سے دوکان کی سیڑھیاں اترتی ہوئی باہر آئی ، اور ایک طرف کو چل دی ، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ ان کو تلاش کرتی رہی۔مگر ان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔یا خدا یہ کیا تھا؟ بہت زور کے بریک لگنے اور ہورن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔وہ ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی، اور اس کا خواب ادھورا رہ گیا۔

اگلے دن اس نے غریبوں میں کپڑے صدقے کر دئے تھے۔

ایک صبح جب وہ فجر کی اذان پر سو کر اُٹھیں تو انہیں ہلکا ہلکا بخار تھا۔نماز پڑھ کر وہ پھر بستر میں بیٹھ گئیں اور تسبیح پڑھنے لگیں۔اتنے میں ضیار ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''السلامُ علیکم امی جان۔''

شادمانی بیگم نے سلام کا جواب دیا۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا، ہاتھ ذرا چہرے سے چھوا تو ضیاء اچانک اچھل گئے۔

''ارے امی! آپ کو تو بخار ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔ چائے وغیرہ پی کر دوا لے لیں۔ میں ابھی حنا کو بھیجتا ہوں''

اور تھوڑی دیر میں حنا کوزی میں چائے، دودھ، چینی اور بسکٹ لئے حاضر ہوگئی۔

''امی لیجئے! چائے لیجئے۔'' حنا نے چائے بنا کر شادمانی بیگم کو دی اور خود بھی چائے لے کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''امی اب آپ آرام کیا کریں۔ آپ کی عمر ایسی نہیں ہے۔''

''میں کیا کرتی ہوں بیٹا، بس تھوڑا ٹہل لیتی ہوں، دو ایک گھنٹے تلاوت، نمازیں اور بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی ہوں، بس۔۔۔ یہ بھی کوئی کام ہیں۔''

''امی اب آپ کو زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ ان چھوٹے موٹے کاموں سے بھی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ بستر پر ہی نماز ادا کر لیا کریں۔ اور یہ کہانی وہانی سنانا آج سے بند۔ دو تین گھنٹے آپ بے آرام رہتی ہیں۔'' حنا کو اپنی خوش دامن جو اس کی پھوپھی بھی تھیں، کا بہت خیال تھا۔

''نہیں بیٹا! اس طرح تو میں اکیلی ہو جاؤں گی اور زیادہ بیمار پڑ جاؤں گی، پھر مجھے تنہائی اور اکیلا پن کاٹنے کو دوڑتا ہے۔''

''اچھا اب آپ آرام کریں۔ اور یہ دوا لے لیں''

حنا نے شادمانی بیگم کو تازہ پانی سے دوا کھلائی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شادمانی بیگم نے بہو کو دعائیں دیں۔ اور بستر پر دراز ہو گئیں۔ انہیں اپنی بہو، حنا پر بڑا ناز تھا۔ خود مانگ کر لائی تھیں بھائی سے۔ حنا نے واقعی گھر سنبھال لیا تھا۔ حنا کی شادی سے، ان کے میکے سے رشتہ داری ایک بار پھر نئی ہو گئی تھی۔ شروع شروع تو حنا انہیں پھوپھی آپا ہی کہتی تھی۔ لیکن شادمانی بیگم نے امی کہلوانا شروع کیا تو پھر حنا امی کہنے لگی تھی۔ شادمانی بیگم

کو لگتا ان کے ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں۔ وہ دونوں میں کوئی فرق نہیں پاتیں، بلکہ حنا خدمت کے معاملے میں صبا سے بہت آگے تھی۔ روزانہ ان کے پاؤں دبانا، کھانے پینے کا خیال رکھنا، کپڑے دھلوا کر، پریس کروانا، اور ہمیشہ طبیعت کے بارے میں پوچھتے رہنا، حنا کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔

اسکول سے آنے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سمیہ دادی کے پاس آگئی اور بولی۔

''دادی آپا! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔؟'' پھر وہ اپنے ہاتھ جوڑ کر خدا سے دعا مانگنے لگی۔

''اے اللہ میاں، ہماری دادی کو ٹھیک کر دے، ورنہ ہماری کہانی، بیچ میں رہ جائے گی۔''

شادمانی بیگم کو سمیہ پر بہت پیار آیا۔ انہوں نے سمیہ کو سینے سے بھینچ لیا، اور خوب پیار کیا۔ اللہ نے سمیہ کی دعا سن لی تھی۔ اور اس رات ایک بار محفل پھر سجی۔ بچے بڑے سبھوں نے شادمانی بیگم کو گھیر لیا تھا۔ اور حنا کے منع کرنے کے باوجود شادمانی بیگم، بچوں کی فرمائش اور اپنی کہانی سنانے کی خواہش کو دبا نہیں پائیں۔ ایک ادھوری کہانی پھر شروع ہوگئی۔

''ہاں تو بچو! میں کہہ رہی تھی کہ شہزادی ابھی پڑھ ہی رہی تھی کہ اس کے رشتے آنے لگے۔ پر شہزادی کے والدین ابھی تیار نہیں تھے۔ مگر جب شہزادہ کا رشتہ آیا تو سب نہ صرف تیار ہو گئے بلکہ بے انتہا خوش بھی۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقص کرنے لگیں۔

رشتہ منظور کرلیا گیا۔ شہزادی چودہ سال کی ہی تھیں کہ ان کی منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔

کیا شاندار پروگرام منعقد ہوا۔ شہزادے کی بہنیں آئیں۔ حویلی کو خوب سجایا گیا۔ شہزادی نے گہرے نیلے رنگ پر سنہرے رنگ کے کام والا بے حد دیدہ زیب لباس پہنا تھا۔ طلائی زیور خود پر رشک کر رہے تھے۔ ان کا حسن آنکھوں میں اترا جا رہا تھا۔ مانو دولت پور کی

اندھیری زمین پر، آسمان سے چاند اتر آیا ہو۔ جو بھی دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ شہزادے کی بہنیں تو ان پر واری واری جارہی تھیں۔ دولت پور کی میراثنیں، ڈھولک پر تال لینے لگیں۔ باہر بینڈ باجے کا شور ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں۔۔۔، ادھر شہزادے کی کوٹھی میں رونق اور شادابی نے ہر طرف شامیانے لگا رکھے تھے۔ بجلی کے قمقمے، اور رنگ برنگی روشنیاں، آنکھوں کو خیرہ کررہی تھیں۔ شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہزاروں مہمان مدعو تھے۔ دولت پور کے ہر خاص وعام کی موجودگی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا لنگرِ عام ہو، جوق در جوق لوگ آ اور جارہے تھے۔ شہزادے نے زردوزی والی سفید شیروانی پہنی تھی، جس میں ان کے مردانہ وقار میں اضافہ ہوگیا تھا۔ پورے دولت پور میں شہزادے اور شہزادی کی منگنی کی دھوم تھی۔

شہزادی اتنی خوبصورت لگ رہی تھی گویا ابھی ابھی پرستان سے اتری ہو۔ گھر کی بزرگ عورتوں نے انگلیاں چٹخا کر بلائیں لیں۔

''خدا آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔''

ہم عمر سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ کوئی کچھ کہتی تو کوئی کچھ۔۔

''او، شہزادے کی شہزادی۔۔۔ چاند کی چاندنی۔۔۔''

شہزادی، جب شہزادے کے بارے میں سوچتی تو اس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ چہرے پر حیا کے رنگ محوِ سفر ہو جاتے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شہزادہ اس کی قسمت میں ہوگا۔ ہاں تصور میں ضرور شہزادے کو بسا رکھا تھا۔ شہزادے کی شرافت، وضع داری اور اخلاق و اطوار کے قصے اس نے بہت سنے تھے۔ منگنی کے کچھ دن بعد، شاید عید کا موقع تھا۔ شہزادہ قمر الدین، شہزادی کے محلے میں آئے تھے۔ ان کے گھر بھی آگئے۔ وہ زنان خانے سے اپنی ہی دھن میں نکل رہی تھی کہ اچانک شہزادے سے سامنا ہوگیا۔

''ارے آپ! ہماری تو عید ہوگئی۔۔۔''

شہزادی نے سر نیچے جھکا لیا تھا۔ اس نے آج پہلی بار شہزادے کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اسے تو کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ تو شہزادے کے شرارت بھرے جملے پر چونکی۔

''حضور آپ تو واقعی عید کا چاند لگ رہی ہیں۔۔۔''

شہزادے کی حاضر جوابی کے بھی چرچے اس نے سنے تھے۔وہ بھی کوئی کم نہیں تھی۔اس نے سوچا جب قمر مخاطب ہے تو چاندنی کو بھی پھوٹ پڑنا چاہیے۔

''جی! ویسے چاند تو آپ کے نام کا حصہ ہے''

شہزادہ کہاں ہار ماننے والا تھا۔اس نے نہلے پر دہلہ مارتے ہوئے جواب دیا۔

''جی، ہاں اب وہ میری زندگی کا بھی حصہ بننے والا ہے۔''

اور شہزادی، شرم کے مارے سرخ ہو گئی تھی۔کوئی جواب نہیں بن پڑا تو کمان سے نکلے تیر کی مانند زنان خانے میں سما گئی۔

منگنی کے بعد شہزادی کے دل میں، شہزادے کی محبت روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر وقت شہزادے کا خیال، تصور میں اس کا سراپا۔ مستقبل کے منصوبے بنانے لگتی کہ شہزادے کے ساتھ پہاڑوں پر گھومنے جائے گی۔ باہر ملکوں میں گھومے گی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب دونوں گھرانوں میں شادی کے شادیانے بجنے لگے۔ شادی کے وقت شہزادی کی عمر اٹھارہ سال کی تھی جبکہ شہزادے خاصی پختہ عمر میں داخل ہو چکے تھے۔ان کی عمر ستائس اٹھائس رہی ہو گی۔ سہیلیوں کے شہزادے کی عمر پر تبصرہ کرنے پر وہ کہتی۔

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا، مردوں کی عمر تو ان کی پختگی اور ذمہ دار ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔''

''بھئی کوئی ایک گلاس پانی پلا دو۔۔'' شادمانی بیگم کا گلا سوکھ رہا تھا۔پانی پینے کے بعد انہوں نے کہانی پھر شروع کر دی۔

''شادی کا کیا بیان کروں۔۔؟ پورا دولت پور شادی کے جشن میں ڈوبا ہوا تھا۔ کئی کئی دن قبل سے دونوں طرف رسومات کا سلسلہ جاری تھا۔عورتیں رات رات بھر شادی کے گیت گاتیں۔

''بنو تیرا جھومر لاکھ کاری۔۔۔''

''بنو تیرا ٹیکہ ہے ہزاری۔۔۔''

''کونے میں کیوں بیٹھی لاڈو، آنگن میں پکار ہے۔۔۔''

''کار ہے دروازے کھڑی دولہا بھی تیار ہے۔۔۔''

کبھی ہلدی کی رسم ہو رہی ہے، تو کبھی مہندی لگائی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گانے بھی بدل رہے ہیں۔ فلمی گانوں پر جھوم جھوم کر ملا زمائیں اور ان کی لڑکیاں، رقص کر رہی ہیں۔ عورتوں کا ہجوم ہے۔ زنان خانے میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے کاموں کے علاوہ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور عشق و معاشقے میں مشغول ہیں۔ کونے کھدروں کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ آخر بارات کا دن آ گیا۔ سید نسیم الدین کی حویلی اور آس پاس کی عمارتوں کو سجایا گیا تھا۔ ہر طرف روشنی کی چادر پھیلی ہوئی تھی، دن کا سا سماں تھا۔ بارات اور مہمانوں کے استقبال کا شاندار اہتمام کیا گیا تھا۔ مرکزی وزراء، ایم پی، ریاستی وزیر، ایم ایل اے، میئر، کمشنر، کے علاوہ پولس انتظامیہ اور سیاسی پارٹیوں کے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے اسٹال لگے تھے۔ ویج اور نان ویج کے علاحدہ الگ الگ۔ پھر خواتین کا انتظام بالکل الگ۔ کبابوں کے الگ اسٹال، آئس کریم الگ، میٹھے کئی اقسام کے۔ چائے کافی، چاٹ پکوڑی، بچوں کے کھانے اور کھیلنے کے سامان الگ، مشروبات کی تو بات ہی کیا؟ پنواڑی، خوشبودار پان کھلا رہے ہیں۔ شہنائی بجانے والے، اپنی دھنوں پر لوگوں کو مست کر رہے ہیں۔ اُدھر شہزادے کے گھر بارات کا اہتمام جاری ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، بگھی، رتھ، موٹر کار، سج دھج کے تیار ہیں۔ گولن دار، بارات کے آگے آگے گولے داغتے جاتے ہیں۔ بارات ایک طویل قافلے کی شکل میں جب سید نسیم الدین کی حویلی پہنچی تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔

دو رویہ قطاروں میں ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے لڑکوں نے بارات کا سلامی کرتے ہوئے استقبال کیا۔ ہر باراتی کو گلاب کا ایک پھول پیش کیا جاتا اور فضا میں خوشبو کے فوارے

چھوڑے جاتے۔ وسیع وعریض احاطے، میں جس کے تین اطراف دالان تھے۔ درمیان میں شامیانے لگے تھے۔ بیچوں بیچ ایک اسٹیج بنایا گیا تھا۔ باراتیوں کے بیٹھنے کے لئے صوفے اور کرسیاں موجود تھیں۔ بارات کے نشست اختیار کرنے کے بعد مشروبات کا دور شروع ہوا۔ جو کافی دیر تک چلتا رہا۔ نکاح کا وقت آیا تو بڑی سادگی سے سارے مراحل پورے ہوئے۔ دونوں طرف کے لوگوں نے اپنی اپنی بندوقوں کا مظاہرہ کیا۔ فضا گولیوں کے دھماکوں سے گونج اُٹھی۔ کھانے سے فارغ ہوکر رخصتی کی تیاری ہوئی۔ رخصتی سے قبل دولہے میاں کو اندر زنان خانے میں سلامی کے لئے لے جایا گیا۔ عورتوں کے ہجوم میں شہزادے کو دیکھنے کی اور تحفے دینے کی ہوڑ سی لگی تھی۔ چلنے کو ہوئے تو پتہ چلا کہ جوتے چوری ہو گئے ہیں۔ شہزادی کی سالیاں آگئیں۔

''ہم تو بہت سارے پیسے لیں گے، تب جوتے دیں گے۔''

شہزادے کی حسِ مزاح بھڑک اُٹھی۔

''ٹھیک ہے آپ جوتے رکھ لیں، ہم دوسرا جوڑا بھی لائے ہیں۔''

اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ساتھ آئے ملازمین سے دوسرا جوڑا لانے کو کہا۔

''رک جا! یہ نہیں چلے گا۔'' شہزادی کی پھوپھی زاد نے نوکر کو ڈانٹا۔

''پیسے نکالو۔۔۔ پورے دس ہزار لوں گی۔۔۔'' پھر وہ شہزادے سے مطالبہ کرنے لگیں۔

''ذرا سا ریٹ کم ہوسکتا ہے۔۔؟''

''بالکل نہیں! ہم اتنی پیاری شہزادی جو دے رہے ہیں۔''

''چیک چلے گا۔'' شہزادہ شرارت کا کوئی موقع گنواتا نہیں تھا۔

''شہزادی بھی ادھار رہی۔۔۔''

''اچھا بابا۔۔''

اور شہزادے نے روپے نکال کر دئے اور پھر جوتے ان کے قدموں میں آگئے۔

شہزادی کے لئے ایک بہت خوبصورت ڈولی کا انتظام کیا گیا تھا۔ کہاروں نے ڈولی اُٹھائی۔ شہزادی کی بہنیں آئیں اور شہزادی کو آخری بار ڈولی میں پانی پلا کر رخصت کیا۔ بارات دھوم دھام سے شہزادے کے محلے میں آئی تو یہاں شہزادی کے استقبال میں زمین و آسمان ایک کر دیئے گئے۔ آتش بازی اور بندوقوں کے فائر ہوتے رہے اور شہزادی کو عورتوں کا ایک گروہ کوٹھی کے اندر لے کر چلا۔ شہزادہ بھی ساتھ ساتھ تھا۔ اچانک شہزادے کی بہنوں نے راستہ روک لیا اور بولیں۔

''بھیا، پہلے ہمارا نیگ دو، نہیں تو ہم اندر نہیں جانے دیں گے۔ راستہ بند.....''

شہزادے نے اپنے گلے سے سونے کی چین اتاری اور نوٹوں کی ایک گڈی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیجئے اب تو راستہ مل جائے گا۔''

اور اس طرح شہزادی کو ان کے کمرے تک پہنچا دیا گیا۔ کمرہ اس طرح سجایا گیا تھا کہ ہر طرف سے خوشبو کے جھونکے آ رہے تھے۔ موتیا اور موگرا کے پھولوں کی لڑیاں الگ سماں پیش کر رہی تھیں۔ گلاب کے پھولوں کا رنگ اور خوشبو فرحت بخش رہی تھی۔ محلے کی عورتوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ہر عورت شہزادی کو دیکھ کر کہتی

''چاند کا ٹکڑا ہے۔ اللہ دونوں کو خوش رکھے۔''

منھ دکھائی میں زیورات اور پیسوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔

''ارے، ذرا پانی لاؤ، میرا تو حلق خشک ہو گیا۔'' اچانک شہزادی بیگم رک گئی تھیں۔ کہانی نے سب کو مٹی کی مورتیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ سب اتنے محو تھے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔

حنا نے پانی لا کر دیا۔ اور کہا۔

''امّی اب بس کیجئے۔ پھر کل سن لیں گے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ ہم تو آج ہی سنیں گے۔'' بچے مچل گئے۔

''نہیں چلو۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔ دیر سے سوؤ گے تو آنکھ نہیں کھلے گی'' اور بحالتِ مجبوری، مجلس برخواست ہوگئی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ شادمانی بیگم نے بھی اللہ سے لو لگالی۔

''ہاں تو یہ ہوا کہ.....''

اگلے دن شادمانی بیگم نے کہانی کو یوں شروع کیا۔

حجلہ، عروسی میں شہزادے اور شہزادی کا ملن ہوا۔ ایک طرف ٹیپ رکاڈر سے گانے بج رہے تھے۔ محمد رفیع کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

''دو ستاروں کا زمین پر ہے ملن آج کی رات.......''

واقعی آج دو ستاروں کا ملن تھا۔ دو بڑے گھرانوں کا ملن تھا۔ دولت پور کے لئے تاریخی دن تھا۔ پورے علاقے میں اس شادی کو لے کر خوب چرچے تھے۔ کوئی دعوت کا ذکر کرتا، تو کوئی بارات کی رونق کی بات کرتا۔ کسی کی زبان پر شہزادی اور شہزادے کی جوڑی کی تعریف، ہر طرف خوشیوں کا رقص، جذبات اور امنگوں کے میلے، بہنوں اور ماں کے ارمانوں کی تعبیریں تھیں۔

وقت کا پرندہ، پرواز کرتا رہا، دولت پور دن بہ دن ترقی کرتا گیا، شہزادہ اور شہزادی میں اتنی محبت تھی کہ دوسروں کے لئے مثال تھی۔ شہزادہ ہر وقت شہزادی کا خیال رکھتا۔ جہاں شہزادی قدم رکھتی، شہزادہ اپنی پلکیں بچھا دیتا۔ شہزادی نے بھی اپنے حسن اور اخلاق و کردار سے شہزادے کی والدہ اور بہنوں اور دیگر افراد کا دل جیت لیا تھا۔ دونوں نے مل کر شہزادے کی سبھی بہنوں کی شادی کے فرائض بھی ادا کئے۔ شہزادی اور شہزادے کو خوشی سجدے کرتی رہی۔ ان کے دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بچے بہت خوبصورت تھے۔ شہزادے کے گھر رونق میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ ان سبھی خوشیوں کے لئے شہزادی کا احسان مند ہوتا کہ

جب سے شہزادی نے اس گھر میں قدم رنجہ فرمائے ہیں گھر خوشیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

دولت پور سے کوئی ۲۰ کلومیٹر پر قصبہ جہانگیر آباد تھا۔ جو ترقی کرتے کرتے شہر بنتا جارہا تھا۔ شہزادے نے بچوں کی تعلیم کے سبب اپنی ایک رہائش جہانگیر آباد میں بھی بنالی تھی ۔اب زمانہ بدل چکا تھا۔ پُرانے اسکول کالج ،واقعی پرانے ہو گئے تھے۔ اب انگریزی کا زمانہ تھا۔ انگلش میڈیم اسکولوں کا بول بالا تھا۔شہزادے نے دونوں کا داخلہ کانوینٹ اسکول میں کرادیا۔

''پھر ایک دن وہ سیاہ رات آئی۔ جس کی سیاہی بہت خطرناک تھی۔ وہ رات، وہ رات۔۔۔''

کہتے کہتے بیگم شادمانی کی آواز بند ہوگئی۔

''دادی۔۔۔دادی...... کیا ہوا''

ریحان نے آگے بڑھ کر دادی کی پیٹھ سہلائی۔ اور حنا جلدی سے ایک گلاس پانی لے آئی۔ پانی پی کر شادمانی بیگم تازہ دم ہوئیں۔ جذبات پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے کہانی کو جاری رکھا......

''وہ رات بہت خطرناک تھی۔ شہزادہ کھانا کھا کر چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہ اچانک انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ کسی طرح سنبھل کر وہ وہیں بیٹھ گئے۔ انہیں گھر لایا گیا۔ ان کی حالت خراب ہو رہی تھی انھیں پسینہ آرہا تھا۔ ڈاکٹرز کو بلایا گیا۔ اسپتال کے ہارٹ سیکشن میں انہیں مصنوعی سانس پہچانے کی کوشش کی گئی۔ بجلی کے شاک سے بھی کام لیا گیا۔ مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ شہزادے کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اسپتال سے جب جسدِ خاکی لایا گیا۔ تو حویلی میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہر کوئی شہزادے کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ شہزادی کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ وہ اس اچانک افتاد سے ایسی ہوگئی گویا سانپ نے ڈس لیا ہو۔ آواز بند، چہرے کا رنگ زرد، آنکھوں میں ویرانی ہی

ویرانی۔ انہیں کچھ بھی احساس نہیں تھا کہ کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے شہزادے کا جامد و ساکت جسم دیکھا، تو اچانک جیسے ندی پر لگا باندھ ٹوٹ گیا ہو، شہزادی نے دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ لوگ انہیں سنبھال رہے تھے مگر لوگوں کو کیا پتہ شہزادی کا کیا کھو گیا تھا۔ وہ تو تہی دامن ہو گئی تھی۔ بھیڑ میں تنہا کی مثال شہزادی پر فٹ ہو رہی تھی۔

اگلے دن جنازے میں ہزاروں کی بھیڑ۔۔۔ دولت پور میں ایسا جنازہ کبھی نہیں ہوا۔ جنازہ جب قصبے سے باہر نکلا تو دکاندار، ٹھیلے والے، کاریگر، مزدور، جوق در جوق جنازے میں شریک ہوتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا دولت پور کی سب سے قیمتی دولت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر جا رہی ہے۔ ۔دولت پور کے محلے ویران تھے۔ ہر طرف شہزادے کا ذکر، اس کے اخلاق و کردار کے تذکرے، مزدوروں، کام والوں، کی زبانوں پر ان کے احسانات کا بیان۔ ہر زبان پر یہی تھا۔

"بھیا ایسے تھے، بھیا ویسے تھے، بھیا نے ہمیں زندگی دی۔"

تین بہنوں کا بھائی، ماں کی آنکھوں کا اکیلا ٹمٹاتا چراغ..... اندھیرے سے لڑتے لڑتے، روشنی پھیلاتے پھیلاتے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ایک سورج کو گھنے سیاہ بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

شادمانی بیگم کی آواز رندھ گئی تھی۔ بچے بھی رونے لگے تھے۔ صبا، ضیا، اور حنا کی بھی ہچکی بندھ گئی تھی۔

اچانک شادمانی بیگم زور سے رونے لگیں۔ انکی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ سانس اُکھڑنے لگی۔ ضیاء نے لپک اُنہیں اپنی گود میں لے لیا۔

"صبا جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔"

ضیاء پریشان ہو گئے۔ بیگم شادمانی کی طبیعت ہر لمحہ بگڑتی گئی۔ اچانک انہوں نے زور کی ہچکی لی۔ اور سانس کا نازک دھاگا ٹوٹ گیا۔ وہ ایک طرف کو لڑھک گئیں۔

''امّی !!!'' ضیا، حنا اور صبا کی چیخوں نے پورے محلے کو جگا دیا۔ ڈاکٹر آ گیا تھا۔ اس نے نبض دیکھی۔ دھڑکن بند تھی۔

''اب کچھ نہیں رہا۔ شی از نو مور۔۔۔'

''دادی۔۔دادی ۔۔۔نانی۔۔۔نانی'' بچے بلک پڑے

گھر میں کہرام مچ گیا۔ قصہ گو خاموش ہو گیا تھا۔ کیسی کہانی ؟ کہاں کے قصے سنانے والے؟ کیسے سامع ؟ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بچوں کی چیخیں، عورتوں کی آہیں، کوٹھی انسانوں کے سمندر کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

وقت دبے قدموں گذرتا رہا۔ دن، مہینے، اور مہینے سال میں تبدیل ہوتے رہے سمیہ پہلے بیگم سمیہ بنی۔ پھر ماں اور پھر سمیہ دادی بن گئی تھی۔

آج اسے بچوں نے گھیر رکھا۔ اس نے کہانی شروع کی

''ایک تھی شہزادی.......''

''ہاں ایک تھی شہزادی، اس کا نام تھا شادمانی بیگم.......''

''سچی کہانی ہے یہ بچو! شادمانی بیگم کو ہم نے دیکھا تھا۔ ہم نے ان کے منہ سے کہانیاں سنی تھیں۔ لیکن ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ہماری دادی شادمانی بیگم ہی دراصل شہزادی تھیں۔ وہ اپنی اصل کہانی سنا رہی تھیں اور ہم شہزادے، شہزادی کی کہانی میں گم تھے۔''

سمیہ تھوڑی دیر کو رکی تو اس کے نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیاں ایک ساتھ بول پڑے۔

''پھر کیا ہوا۔۔۔؟''

''پھر یہ ہوا کہ شہزادے کے انتقال کا واقعہ سناتے سناتے شہزادی بھی اپنے شہزادے کے پاس چلی گئی۔۔۔''

''بچو چلو۔ سو جاؤ۔ آج کہانی یہیں ختم، باقی ادھوری کہانی کل پوری کروں گی۔''

دن کے اندھیرے، رات کے اجالے

میں قبرستان ہوں۔ آپ مجھے ضرور جانتے پہچانتے ہوں گے۔ کبھی نہ کبھی آپ ضرور یہاں آئے ہوں گے۔ آپ کسی جنازے کے ساتھ میرے احاطے میں آئے ہوں گے، شب برات میں تو ضرور کسی قبر پر فاتحہ پڑھنے یا چراغاں کرنے آئے ہوں گے۔ میری ویرانی کو دیکھ کر آپ کو ڈر بھی لگا ہوگا۔ موت یاد آئی ہوگی۔ آپ نے گناہوں سے توبہ کے لئے استغفار کیا ہوگا۔ لیکن مجھے پتہ ہے کہ مجھ سے دور ہونے پر آپ نے ساری قسمیں اور وعدے، توڑ ڈالے ہوں گے۔ کوئی بات نہیں، یہ دنیا اور زندگی تو عمل کی جگہ ہے۔ آپ جیسا عمل کریں گے، بعد میں ویسا ہی اجر پائیں گے۔ ایک راز کی بات بتاؤں۔ غور سے سننا۔ اچھا پہلے میں اپنا تفصیلی تعارف کرادوں۔ میں بلند شہر کے گاؤں دھنورا کا قبرستان ہوں۔ میری عمر یہی کوئی ۴۰۰ رسال ہوگی۔ ابھی کم عمری ہی میں، میرا سینہ فخر سے بلند ہے کہ میرے سینے میں ہزاروں راز دفن ہیں۔ میں گاؤں کے مغربی کنارے پر آباد ہوں۔ ویسے تو میرا سینہ اندرونی طور پر مسلمانوں سے آباد ہے لیکن باہری سطح پر مسلم اور غیر مسلم دونوں نے میری ظاہری ویرانی کو کم کر رکھا ہے۔ صدیوں سے گاؤں کے لوگ میرے سینے پر اپنے روزمرہ کے کام کاج کرتے آرہے ہیں۔ میں انہیں کھیلتا کودتا دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہوں کہ چلو کچھ دن کھیل لو، پھر تو میرے سینے میں ہی ہمیشگی کی زندگی گذارنی ہے۔

ہاں تو، لو آج میں تمھیں اپنی داستان سناتا ہوں۔ غور سے سنو! کوئی درمیان میں نہیں بولے گا۔ جب تک میں خود ہی آپ کو مخاطب نہ کروں۔

سبھی خاموش ہوگئے۔ زمین، آسمان۔ ہوائیں گھٹائیں، چرند، پرند، انسان.....

سب خاموش اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔ صرف قبرستان کی آواز بلند ہوتی رہی۔

''یہ دِوال میری لاش پر بنے گی۔''

عزیز بھائی کی آواز پر پورا مجمع چونک کر انھیں دیکھنے لگا تھا۔ وہ غصہ سے آگ ببولا، اپنی دھوتی کو گھٹنے سے اوپر کئے۔ دیوار کی کھدی ہوئی بنیاد میں کھڑے تھے۔ ان کے تیور اور بزرگی کو دیکھتے ہوئے، بابو جی نے بھیڑ کو روکا، پھر پیچھے گھوم کر دیوار بنا رہے مزدوروں سے بولے۔

''بھئی کام روک لو۔ ذرا دیر سانس لے لو۔''

کام رک گیا تھا۔ سب حیرانی سے بنیاد کی نالی میں کھڑے عزیز بھائی کو دیکھ رہے تھے۔ دراصل دھنورا کے قبرستان کی چہار دیواری کا کام چل رہا تھا۔ زمانے سے قبرستان کی اراضی یوں ہی پڑی تھی۔ ایک کونے میں قبریں بنائی جاتیں، برسوں بعد دوسرے کونے کی باری آتی۔ قبرستان کی زمین دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ قبریں بہت کم تھیں۔ زیادہ تر قبریں کچی مٹی کی تھیں اسی لئے جلد برابر ہو جاتی تھیں۔ قبرستان میں صرف ایک پختہ قبر تھی۔ یہ گاؤں کے منشی سجاد حسین کی قبر تھی۔ سنا ہے کہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ پاس کے قصبہ کے اسکول میں مدرس تھے۔ بڑے نیک دل اور خداترس انسان تھے۔ بے شمار شاگردوں کو پڑھا لکھا کر زندگی گذارنے کے لائق بنا دیا۔ ان کی قبر کے چاروں طرف نو رانچ کی اینٹوں کی دیوار تھی اور ایک طرف لوہے کا گیٹ لگا تھا۔ اندر بیلا کے پیڑ تھے۔ جن پر سفید پھول کھلا کرتے تھے۔ لوگ صبح صبح قبرستان آتے تو منشی جی کی قبر سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی رہتی۔ لوگ قبر کے پھول ضرور لے کر جاتے۔ قبرستان، دھنورا کے لوگوں کے دلوں کی طرح کشادہ تھا۔ قبرستان میں لوگوں نے اپنے اپنے بونگے، بٹورے اور کوڑیاں بنا رکھی تھیں۔ قبرستان مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے بھی استعمال میں آتا تھا۔ بیسا کھ آتا تو گیہوں کی پولیوں کے انبار قبرستان میں ہر طرف دکھائی دیتے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان۔ سب کے لانک

(فصل کے انبار) قبرستان میں رکھے جاتے۔ پہلے تو بیلوں سے لانک سے گیہوں نکلوانے کا کام کیا جاتا تھا۔ کئی کئی دن کی دائیں (بیلوں کے ذریعہ اناج نکالنے کا عمل) کے بعد بیلوں کے پیروں سے گیہوں کی سوکھی پولیوں کا چورا ہو جاتا تھا پھر اسے تیز ہوا کے رخ پر برسا کر بھس اور گیہوں کو الگ کیا جاتا۔ قبرستان کے پورب میں گاؤں کے گڈریے رہتے تھے، اتر کی طرف دگڑا (کچا راستہ) اور اس کے بعد مسلمان لوہار، بڑھیوں کے مکان تھے۔ دکھن کی طرف گوجروں کے کھیت تھے۔ جبکہ پچھم کی طرف گسائیوں کی آبادی تھی۔ صدیوں سے قبرستان گاؤں کی خوشحالی کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ کسی کی موت ہوتی تو ضرور غم کا ماحول چھا جاتا۔ خود ہی قبر کھودتے اور مردے دفناتے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن خدا سیاست دانوں کو غارت کرے۔ فرقہ پرستی کا ایسا زہر گھولا کہ نفرتوں کی فصل ہر طرف لہلہانے لگی۔ صدیوں سے آپسی میل جول سے رہتے آرہے گاؤں کے سیدھے سچے لوگوں میں بھی نفرت، خوف، دہشت، مذہبی جنون اور فرقہ پرستی کے سنپولیے پلنے لگے۔

''بابو جی اب کیا ہوئے گو؟''

کنور پال نے بابو جی کو آواز لگائی تو وہ خیالات کے دھند لکے سے باہر آئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عزیز بھائی کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے پیچھے چاچا ملکھان، سری گر چاچا، رام چندر کے علاوہ دس بارہ ہٹے کٹے نوجوان لاٹھی بلم لیے ساتھ ہو لیے۔ رام چندر نے لاٹھی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بڑے غصے سے کہا۔

''بابو جی۔ آپ اک اور کو ہو جاؤ۔ میں ابھی گرادن گو، یا کی لاش.........دوال تو بن کر رے گی۔''

ایک ہاتھ سے رام پال کی لاٹھی پکڑتے ہوئے بابو جی نے رام پال کو ڈانٹا۔

''پاگل نہ بنو۔ خون خرابے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' پھر وہ عزیز بھائی سے مخاطب ہوئے۔

''ہاں بھئی کیا بات ہے؟ جب تمہیں سمجھا دیا تھا تو پھر کیا آفت آگئی۔ دیکھو یہ

قبرستان کا کام ہے۔ثواب کے بدلے میں گناہ نہ کما۔"

عزیز بھائی اب بھی بنیاد کی نالی میں کھڑے تھے۔

"پہلے میری کوڑی کو کوئی انجام کرو۔ جب بنن دن گو۔"

عزیز بھائی کی بات پر ایسے اور بھی مسلمان سامنے آ گئے تھے جن کے کام قبرستان میں ہوا کرتے تھے۔ غریب مسلمانوں کے پاس تھوڑی سی زمینیں تھیں۔ کچھ دوسروں کے کھیتوں پر کام کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ چہار دیواری نہ ہونے سے قبرستان کی زمین سب کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ دو بٹیا بھی قبرستان کے بیچوں بیچ سے گذرتی تھیں۔ شادی بیاہ ہوتے تو قبرستان کی زمین کا استعمال کیا جاتا۔

گاؤں دھنورا ضلع بلند شہر کا ایک ہندو اکثریتی گاؤں تھا۔ یوں تو گاؤں میں گوجر، گسائیں، گڈریے، ہریجن، ٹھاکر، شیخ، لوہار، بڑھئی، دھوبی سبھی رہتے تھے لیکن گاؤں میں گوجروں کا دبدبہ تھا۔ ایک تو گوجر تعداد میں زیادہ تھے دوسرے مال و دولت، زمین جائیدار کے معاملے میں وہ دوسری قوموں سے کہیں آگے تھے۔ اسی سبب دھنورا، آس پاس کے علاقے میں گوجروں کے گاؤں کے نام سے بھی مشہور تھا۔

دھنورا میں مسلمان کم تعداد میں تھے۔ یہاں کے آبائی مسلم باشندے شیخ، لوہار اور بڑھئی تھے۔ شیخ خاندان کے لوگ سوانگ، نوٹنکی، گانے بجانے اور حقہ کے نیچے بنانے کا کام کرتے تھے۔ جبکہ لوہار اور بڑھئی گاؤں والوں کے کھیتی کے اوزار اور روز مرہ کے سامان بناتے تھے۔ یہ کام دو طرح کی اجرت پر ہوتے تھے۔ زیادہ تر کسان سال بھر اپنا سامان بنواتے اور فصل کے وقت دو من یا چار من اناج بطور اجرت دیا کرتے۔ اناج کے علاوہ بھس، ہرا چارہ، اور دیگر سامان بھی کسان کبھی کبھار بھیج دیا کرتے تھے۔ دوسرے چھوٹے موٹے کام، بہت سے لوگ نقد بنوا لیتے۔ جن کے بدلے فوری طور پر اناج یا کوئی دوسرا سامان دے جاتے۔

گاؤں میں آپسی میل جول بہت تھا۔ صدیوں سے ہندو مسلم شیر وشکر کی طرح رہتے آئے تھے۔ شادی بیاہ میں ایسی شرکت کرتے کہ لگتا ہی نہیں دو ہیں۔ گاؤں کے دامادوں

کی یکساں خاطر ہوتی۔ مسلمانوں کی بیٹی اور داماد آتے تو غیر مسلم اپنے بیٹی داماد جیسا سلوک کرتے۔ مسلمان کسی گاؤں میں جاتے تو وہاں گاؤں کی بیاہی بہن۔ بیٹی کو تحفے اور نذرانے دے کر آتے۔ بچے گاؤں کے سبھی بڑوں کو چاچا، تاؤ، بابا کہہ کر پکارتے۔ گاؤں میں کسی کے اکھ بونے کا وقت ہوتا تو پورے گاؤں میں چہل پہل ہوتی۔ کچھ دن قبل ہی کی بات ہے ترکھا بابا کے یہاں اکھ بوئی جانے والی تھی۔ ایک دن پہلے ہی گاؤں میں خبر کردی گئی۔

''بھئی کل، باگ والے کھیت میں اکھ بووئے گی۔ جرور آئیو۔''

اور اگلے دن صبح صبح بابا ترکھا کے کھیت پر خاصی بھیڑ موجود تھی، کئی لوگ مل کر گانڈے (گنے) کے ایک ایک فٹ کے ٹکڑے، بیج کیلئے کاٹ کر ڈھیر لگا رہے تھے۔ بیلوں کی چار جوڑیاں کھیت جوت رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے چار لوگ گانڈے کے ٹکڑے ڈالتے اور پیر سے داب تے چلے جاتے۔ کچھ لوگ گانڈے کے ڈھیر سے، اکھ بونے والوں کو گانڈے لالا کر دے رہے تھے۔ چار بیگھہ کھیت میں اکھ بونے کا کام دس بجے تک پورا ہو گیا تھا۔ آخر میں کھیت میں بکھرے کوڑ کباڑ اور اوزاروں کو اکٹھا کیا گیا۔ اتنے میں ترکھا بابا کی آواز گونجی۔

''سب گھر چلن گے۔ کھیر پوری کی دعوت ہے۔''

بس پھر کیا تھا۔ بچے بوڑھے مرد عورتیں سب اپنا اپنا سامان سمیٹ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ترکھا بابا کے گھر ایک دن پہلے ہی سے اکھ کی دعوت کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ کئی گھروں سے دودھ، رات ہی میں جمع کرلیا گیا تھا۔ صبح صبح گاؤں کی عورتیں اور ترکھا بابا کی بہوویں کھیر اور پوری کی تیاری میں لگ گئی تھیں۔ بیٹھک کی زمین کو ایک دن پہلے ہی گوبر اور مٹی سے اچھی طرح لیپ دیا گیا تھا۔ بیٹھک کا فرش ایسا لگ رہا تھا گویا پورے فرش پر سونے کا پانی چڑھا دیا گیا ہو۔ جلد جلدی لوگ آمنے سامنے قطاروں میں اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں کھانا کھلانے والے آ گئے تھے۔ کوئی پتل بچھا رہا تھا۔ کوئی بالٹی سے کھیر نکال کر پتل پر انڈیل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پوریاں دینے والے تھے۔ مٹی کے سکوروں

میں پانی رکھ دیا گیا تھا۔

بابو جی کی گرج دار آواز سنائی دی۔

''جس کے پاس نہ آیا ہو وہ مانگ لے۔ باقی پڑھو بسم اللہ۔''

سب نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ نظارہ شادی کے کھانوں کے وقت بھی نظر آتا تھا۔

گاؤں میں کسی ہندو کی موت ہو جاتی تو مسلمان ہندو سب مل کر ارتھی تیار کرتے اور کاندھا دیتے ہوئے شمشان گھاٹ لے جاتے۔ عجیب اتفاق تھا کہ گاؤں میں شمشان گھاٹ کی زمین پر آس پاس کے ہندوؤں نے ہی آہستہ آہستہ قبضہ کر لیا تھا۔ اب کھڑ نجے پر انتم سنسکار ہوا کرتا تھا۔ بہت کوششوں کے بعد بھی شمشان کی زمین نہیں مل پائی تھی۔ گاؤں میں دو مندر تھے، مسجد نہیں تھی۔ لیکن قبرستان بہت پہلے سے تھا۔ کسی مسلم کی موت ہوتی تو ہندو مسلم مل کر قبر کھودتے۔ قبرستان کے ہی درختوں کی موٹی شاخیں کاٹی جاتیں، ان کے موٹے موٹے ٹکڑوں کو میت کے اوپر قبر کے بگدے میں لگایا جاتا، پھر گھاس پھوس سے لکڑیوں کے درمیان کی درج کو بھرا جاتا اور مٹی ڈالی جاتی۔ سرہانے کسی سائے دار پیڑ کی ٹہنی لگا دی جاتی۔

قبرستان کی چہار دیواری کا سلسلہ بو با جی نے اٹھایا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ملک کا ماحول خراب ہوتا جا رہا تھا، ایسے میں قبرستانوں اور مساجد کی حفاظت بہت ضروری ہو گئی تھی۔ دوسرے قبرستان کے دکھن میں گوجروں کے کھیت تھے۔ جن میں کئی نے اپنے گھیر اور گھر بنانا شروع کر دئے تھے۔ اس بات کا خطرہ بڑھ گیا تھا کہ دکھن کی طرف سے آہستہ آہستہ قبرستان سکڑنے نہ لگے۔ لیکن قبرستان کی چہار دیواری کی بات پر گاؤں میں نئی قسم کی ہلچل شرو ہو گئی تھی۔ کچھ مسلمانوں نے ہی اس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ گاؤں کے بزرگ اور سمجھدار مسلمانوں کو بابو جی نے اس بات کی اہمیت سمجھائی۔

''دیکھو بھئی..... ملک کے حلات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ ہندو مسلم

منافرت پھیلتی جارہی ہے۔گاؤں میں تو خیر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ پھر بھی قبرستان کو آگے تک بچانا ہے تو اس کی چار دیواری کرانی ہوگی۔''

''بات تو سہی کہو ہو باؤ جی۔'بابا بشیر بولے۔

''دھرم ویرنے قبرستان کی پلی اور اپنا گھیر بھی بنوالیو ہے۔موئے تو وا کی نیت پر شک ہووے ہے۔'' چاچا نثار دور کی کوڑی لائے تھے۔

''ٹھیک ہے تو یا کام کو جلد شروع کرواؤ باؤ جی۔'' نئی عمر کے مشتاق بھائی نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔

بابو جی گاؤں کے پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے دسویں پاس کی تھی، ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی جانتے تھے۔ وہ دور شہر میں چالیس برس نوکری کرنے کے بعد اب گاؤں میں رہنے لگے تھے۔ان کے بیٹے بھی دلی میں اپنے اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔ بابو جی ہر وقت گاؤں کی خدمت میں لگے رہتے۔ زمین کی پیمائش کا کام تو بابو جی کے علاوہ کوئی نہیں کر پاتا تھا۔ادھر بابو جی نے انجکشن لگانا بھی سیکھ لیا تھا۔اب وہ گاؤں کے بیماروں کے انجکشن بھی لگا دیا کرتے تھے۔لڑائی جھگڑوں کے فیصلے کے لئے گاؤں والے بابو جی کے پاس ہی جاتے۔سب ان کے فیصلے کا احترام کرتے تھے۔ وہ بہت دوررس تھے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ دراصل نئی نسل کے ذہنوں کو سیاسی جماعت والے جلدی متاثر کر لیتے ہیں۔ ویسے تو گاؤں میں ماحول ٹھیک ہی تھا لیکن مستقبل کا کیا پتہ۔ بابو جی نے حکمت سے گاؤں کے ہندوؤں کو بھی قبرستان کی چار دیواری کے لئے تیار کرلیا تھا۔ بلکہ ان میں سے کئی تو اس کام کے لئے ہر وقت بابو جی کے ساتھ تھے۔انہوں نے قبرستان کا استعمال کرنے والے ناراض ہندوؤں کو بھی قبرستان خالی کرنے کے لئے راضی کرلیا تھا۔لیکن معاملہ اس وقت بہت نازک ہوگیا تھا جب قبرستان کا ذاتی استعمال کرنے والے کچھ مسلمانوں نے قبرستان خالی کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔

''باؤ جی..... کچھ بھی ہو جائے ہم چار دواری نہ بنن دن گے۔''عزیز بھائی نے

بابو جی سے انتہائی غصہ کی حالت میں کہا۔

''ہم اپنے جانور کہاں باندھن گے؟ کوڑی کہاں ڈلے گی؟ ناج کہاں نکلے گو؟''

''ہاں ہاں عزیز بھائی۔ میں بھی تمہارے سنگ ہوں۔'' الیاس بیچ میں ہی بول پڑا۔

پھر تو کئی آوازیں ایک ساتھ مخالفت میں بلند ہونے لگی تھیں۔ بابو جی کو اپنی محنت پر پانی پھرتا دکھائی دیا۔ انہوں نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

''بھئی دیکھو۔ یہ کوئی میرا ذاتی کام تو نہیں۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔ خود سوچو ہم برسوں سے قبرستان کی بے حرمتی کرتے آرہے ہیں۔ یہاں ہمارے بزرگ دفن ہیں اور ہم قبروں پر نہ صرف چلتے پھرتے ہیں بلکہ جانور گندگی بھی کرتے ہیں۔ موت تو برحق ہے۔ سب کو آنی ہے۔ قبرستان نہیں رہے گا تو دفن کے لئے کہاں جاؤ گے؟ سمشان گھاٹ کے بغیر مردے سڑک پر جلائے جاسکتے ہیں لیکن قبرستان کے بغیر..........؟''

آواز رک گئی تھی۔ خاموشی.......... ہر طرف خاموشی۔

سناٹا طویل ہوتا گیا تھا۔ اس سے قبل کہ چہ مے گوئیاں شروع ہوتیں، قصہ گو کی آواز پھر بلند ہوئی۔

''داستان درمیان میں روکنے کا بھی ایک سبب ہے۔

میں کئی صدی سے اس گاؤں میں آباد ہوں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پہلے لوگ میرے نام سے ہی ڈرتے تھے۔ میرے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ ویرانی، وحشت، خاموشی، تنہائی، سناٹے میرے گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ بہت خوش تھا۔ کوئی قبر کھودی جاتی تو مجھے مسرت کا احساس ہوتا۔ جنازہ لئے جب لوگ میرے دامن میں آتے، مجھے خوشی ہوتی، ہر طرف سے لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے کلمات بلند ہوتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے گئے۔ گاؤں میں امیبا کی طرح جب خاندان بڑھنے لگے تو مکانات، قدموں قدموں چلتے، گاؤں کے باہر بھی نکل آئے تھے۔ میرے آس پاس

بھی گھر آباد ہونے لگے۔ ہندو اور مسلم دونوں نے اپنی زندگی آمیز حرکات وسکنات سے میرے احباب ویرانی، وحشت، خاموشی، تنہائی اور سناٹے کو یکے بعد دیگرے اپنی موت آپ مرنے پر مجبور کردیا تھا۔لوگوں نے میرے اوپر سے راستے بنالیے۔اپنے بونگے، بٹورے، کوڑی بنانا اور دوسرے کام شروع کردئے۔ جانور باندھے جانے لگے۔کھیت سے فصل کٹتی اور میرے اوپر کھلیان بنائے جاتے۔حتی کہ شادی بیاہ میں بھی میرا استعمال ہونے لگا۔حد تو یہ ہوگئیکہ لوگ میرے اوپر پیشاب پاخانہ بھی کرجاتے۔ مجھے بڑی گھن آتی۔نفرت اور غصے سے میں انہیں دیکھتا رہتا۔ میں کیا کرتا؟ کس سے شکایت کرتا؟ ان سب کے باوجود مجھے سب سے اچھا گاؤں کا اتفاق واتحاد لگتا تھا۔ میں اپنی بے عزتی بے حرمتی اور پامالی پر خون کے گھونٹ پی کر یہی سوچتا رہ جاتا کہ خدا نہیں کبھی تو عقل وفہم دے گا اور انہیں کبھی تو میرا خیال آئے گا۔

سنو! ذرا غور سے سنو!

میری داستان میں اب عروج آنے والا ہے۔

''ہمیں کچھ نہ پتو، جب مرن گے جب دیکھن گے۔''

عزیز بھائی اپنے موقف پر اٹل تھے۔ بابو جی کے سمجھانے سے بہت سے مخالفین مان گئے تھے لیکن دیوار کے سلسلہ میں کوئی چندہ یا مدد دینے سے انکار کردیا تھا۔ بابو جی نے گاؤں اور شہروں سے چندہ جمع کرکے اینٹیں منگوالی تھیں۔ سیمنٹ بھی آگیا تھا۔ پوری تیاریاں ہونے کے بعد چہار دیواری کے لئے جمعہ کا دن منتخب ہوا تھا۔گاؤں کے سمجھ دار قسم کے ہندو بھی بابو جی کے ساتھ تھے۔

''باؤجی آپ پھکر نہ کرو۔ کام جوڑ د۔ پھر دیکھن گے کس میں کتنو دم ہے۔''

''چار دیواری کا کام دکھن کی طرف سے شروع ہوگیا تھا۔ جہاں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا۔لیکن گاؤں میں آہستہ آہستہ افواہیں گرم تھیں کہ عزیز بھائی اور ان کے بیٹے بلم

اور کٹے وغیرہ کا انتظام کر رہے ہیں، ان کے گھر کے سامنے خون خرابہ ہو سکتا ہے۔

بابو جی اور عزیز بھائی ایک ہی خاندان کے افراد تھے۔ دو بھائیوں کی اولادیں تھیں۔ بڑے بھائی کے پانچ اور چھوٹے کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بھائی کے پانچوں بیٹوں کے بیٹے، پوتے، پوتیاں تقریباً پچاس لوگوں کا کنبہ تھا جو قبرستان کی مخالفت پر آمادہ عزیز بھائی کا طرف دار ہو سکتا تھا۔ سب ایک ہی تھے۔ ایک ساتھ کھاتے پیتے۔ کام کرتے۔ بڑا سا آنگن تھا جس کے چاروں طرف مکانات تھے۔ ہر کام ایک ساتھ۔ دانت کاٹی روٹی، ایک اپنے گھر کھانا کھاتا تو بابو جی کے یہاں پانی پیتا۔ رشتہ داریوں میں جاتے تو بابو جی خود بڑھ کر سب کا کرایہ ادا کرتے۔ کوئی معاملہ الجھ جاتا تو بابو جی منٹوں میں سلجھا دیتے۔ دور دور تک لوگ بابو جی کو احترام کی نظر سے دیکھتے۔ بابو جی کہہ کر پکارتے۔

ایک بار کا ذکر ہے۔ قبرستان اور دگڑے کے بیچ میں ایک کوئیاں تھی۔ چھوٹی سی کوئیاں۔ بیس بائیس فٹ گہری اور چار فٹ گولائی والی۔ کوئیاں کی صفائی چل رہی تھی کہ اچانک بابا صدیق کا بڑا بیٹا اختر نجانے کیسے کوئیاں میں گر پڑا۔ پاس ہی بابو جی کھڑے تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ خود کوئیاں میں چھلانگ لگا دی اور اس سے قبل کہ کوئیاں کا پانی بچے کو نقصان پہنچاتا، بابو جی نے بچے کو بچا لیا۔ بعد میں اوپر سے رسی سے باندھ کر ٹوکرا لٹکایا گیا اور بچے کو صحیح سلامت نکالا گیا۔ سب نے بابو جی کی بہت تعریف کی تھی۔ ایسے سینکڑوں معاملات و واقعات تھے جب بابو جی نے اپنی عزت داؤ پر لگا کر گاؤں کی عزت بچائی تھی۔ بڑے بابا کے بچوں کا بٹوارہ ہوا تو بابا صدیق کو انھوں نے زمین جائیداد سے الگ کر دیا تھا۔ اس وقت بابا صدیق گاؤں چھوڑ کر جانے کو تیار تھے۔

''میں تو گاؤں چھوڑ کر جارا اوں۔''

بابا صدیق کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسمٰعیل بابا نے بہت سمجھایا تھا۔ لیکن وہ کسی قیمت پر رکنے کو تیار نہ تھے۔ ایسے میں بابو جی نے اپنی قربانی دے کر معاملے کو سنبھالا تھا۔

''صدیق بھائی تم گاؤں نہیں چھوڑو گے۔ زمین کی ہی بات ہے نا۔ لو میرے

حصے کی اس زمین میں گھر بنالو۔'' اور انہوں نے اپنے حصے کی زمین پر بابا صدیق کا گھر بنوایا دیا تھا۔

قبرستان کی چار دیواری کے معاملے کو تین سال ہو گئے تھے۔ پتھر کی سلوں کی طرح مضبوط و مستحکم دلوں میں شگاف پڑ گئے تھے۔ ذاتی مفاد، تعلقات کی زمین کھود رہے تھے۔ لیکن کہتے ہیں نا ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔ عزیز بھائی کو لاکھ سمجھایا گیا لیکن وہ نہیں مانے۔

''نا میں نا بنن دن گو.....''

گاؤں کے غیر مسلم بزرگوں اور نوجوانوں نے عزیز بھائی کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور مزدوروں نے جلدی جلدی دیوار چن دی تھی۔ کچھ دیر بعد عزیز بھائی نے بھی ہارے ہوئے جواری کی طرح سپر ڈال دی تھی۔ انہیں اپنی شکست کا اتنا زبردست صدمہ پہنچا تھا کہ انہوں نے چارپائی پکڑ لی تھی اور کچھ دن بعد چارپائی نے ڈولے کی شکل اختیار کر لی۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں اپنے کھیت کے ایک کونے میں دفنایا گیا۔ آپسی محبتیں نفرتوں، بغض و عداوت اور دشمنی میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ وقت کے ساتھ سب کچھ بدلتا چلا گیا۔ چہار دیواری کرانے والے بزرگ اللہ کے یہاں چلے گئے تھے اور ان کی اولادیں زیادہ تر شہروں میں جا بسی تھیں۔ اُدھر عزیز بھائی کے کھیت کا کونا وسیع ہوتا گیا.........اور..........

آواز بند ہو گئی تھی..........

خاموشی نے مارشل لا لگا دیا تھا۔

اچانک کسی کے سسکنے کی آواز بلند ہوئی۔

میں..........میں..........پھر ویران ہو گیا ہوں۔ میں نے ویرانی، سناٹے اور وحشت سے ایسی دوستی کی خواہش نہیں کی تھی۔

اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ کوئی میرے آنسو پونچھنے والا بھی نہیں۔

جنازے میرے پاس سے گزر کر کھیتوں والے علاقے کو آباد کرتے ہیں میرے

دامن کی قبریں اپنا ظاہری وجود بھی کھو چکی ہیں۔ چار دیواری کی اینٹیں لوگ حسبِ ضرورت اپنے گھروں میں لے جا چکے ہیں۔ میں ایک چٹیل میدان ہو گیا ہوں۔ کبھی کبھار بچے کرکٹ کھیلنے آجاتے ہیں۔ میری شناخت ختم ہوگئی ہے۔ شاید یہ میرا آخری وقت ہے۔ ہر شئے کو موت آتی ہے۔ لیکن شاید مجھے آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ وقت ابھی پورا نہیں ہوا ہے مجھے انتظار ہے، خاندان کے اس وسیع عریض آنگن والے مکان میں اٹھنے والی دیواروں کی طرح اپنے قریے اور خطے میں اگنے والی دیواروں کا۔ جب مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بلند و بالا عمارتوں کی آماجگاہ بنا دیا جائے گا۔ وہ شاید میری داستان کا آخری صفحہ ہو۔

مرکزی حکومت کے منصوبے کے مطابق این سی آر میں آس پاس کے علاقے کو شامل کرتے ہی خالی پڑی زمینوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ صدیوں سے مردہ پڑی دھنورا قبرستان کی زمین، آس پاس کی زمینوں کے ساتھ ایک بڑے Power Plant کے لئے منتخب کی جا چکی تھی۔ اندھیرے دن کے اجالے میں ضم ہو کر رات کی کوکھ سے نئی روشنی کی شکل میں نمودار ہو رہے تھے۔

□□□

ہوئے تم دوست جس کے

الہ آباد ریلوے اسٹیشن، الہ آباد کی طرح خاصا پھیل گیا تھا۔ ٹرینوں کی تعداد اور ان کی آمد و رفت میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ اکثر دہلی سے آنے والی کئی ٹرینوں کو صوبے دار گنج میں ہی روک دیا جاتا ہے۔ جب پلیٹ فارم خالی ہوتا ہے تو ٹرین کے لیے ہری بتی کا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور ٹرین شرمندہ شرمندہ سی، کیونکہ وہ پہلے ہی لیٹ ہو چکی ہوتی ہے، دبے قدموں الہ آباد میں داخل ہوتی ہے اور کونے کھترے، چھٹے یا ساتویں نمبر کے پلیٹ فارم پر مسافروں کو رخصت کہتی ہے۔

یوں تو یہاں سے راجدھانی ایکسپریس، دورنتو، شتابدی کے علاوہ بھی کئی خاص ٹرینیں گذرتی ہیں۔ لیکن یہاں کی دو مشہور ٹرینیں ہیں۔ نوچندی اور سنگم ایکسپریس۔ یہ دونوں ہی ٹرینیں الہ آباد سے چل کر میرٹھ تک جاتی ہیں۔ سنگم کا راستہ کانپور سے اٹاوہ، ٹونڈلہ، فیروزہ آباد، علی گڈھ، بلند شہر کو چھوتے ہوئے ہاپوڑ اور میرٹھ پہنچتا ہے۔ جب کہ نوچندی ایکسپریس لکھنؤ، بریلی، شاہ جہاں پور، رام پور، مراد آباد ہوتے ہوئے ہاپوڑ اور پھر میرٹھ پہنچتی ہے۔ الہ آباد سے ان دونوں ٹرینوں کی روانگی شام میں 5 منٹ کے فاصلے سے ہوتی ہے۔ میرٹھ اور الہ آباد کے فاصلوں کو ایک شب میں طے کرنے والی یہ دونوں ٹرینیں خاصی مشہور ہیں۔ یہ اتر پردیش کی سیاسی راجدھانی لکھنؤ اور صنعتی راجدھانی کانپور کو مس کرتی ہوئی گذرتی ہیں۔ اس سے یہاں کے لوگوں کے دلوں کے فاصلے بھی کم ہوتے ہیں اور پریشانیاں بھی۔ یہ دونوں ٹرینیں میرٹھ اور الہ آباد کی شناخت ''نوچندی میلہ'' اور گنگا جمنا کے ملن ''سنگم'' کے ناموں سے جانی جاتی ہیں۔

میں الہ آباد کسی ضروری کام سے آیا تھا۔ الہ آباد ضروری کاموں کی آماجگاہ ہے۔ ہائی کورٹ خود کاموں کی ایک بہت بڑی منڈی ہے۔ اس منڈی کی اہمیت برقرار رکھنے کی وجہ سے ہی برسوں کی جدو جہد کے بعد بھی ابھی تک میرٹھ میں ہائی کورٹ بینچ کو منظوری نہیں ملی ہے۔ یو پی سیکنڈری اسکول بورڈ سے لے کر تمام ضروری تعلیمی بورڈ الہ آباد میں موجود ہیں۔

لکھنؤ اتر پردیش کی سیاسی راجدھانی ضرور ہے لیکن الہ آباد کو کاموں اور سرکاری دفاتر کے لحاظ سے راجدھانی کا ہی درجہ حاصل ہے۔ آپ اتر پردیش میں، زندگی کے کسی بھی سیکٹر سے متعلق ہوں، آپ کا کام الہ آباد سے ضرور پڑے گا کچھ نہیں تو سیر و سیاحت ہی سہی۔ گنگا اور جمنا کا وصال تو آپ کو ضرور اپنی طرف بلائے گا۔ ایسا لگتا ہے گویا زمانے سے، ہجر کے کوہ و دشت میں دوڑتے بھاگتے، گھسٹتے، سرکتے عاشق و معشوق بالآخر الہ آباد کے دل سمندر میں اس قدر ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں کہ غرق ہو جاتے ہیں، ضم ہو جاتے ہیں اور اپنی شناخت مٹا کر دونوں ایک نئی شناخت کے ساتھ پھر ایک دوسرے کے گلے میں بانہوں میں بانہیں ڈالے ایسے محوخرام ہوتے ہیں کہ دودھ اور پانی کی مثال بھی شرمندہ ہو جاتی ہے۔ گنگا کے ساحل پر اکبر کا قلعہ بھی اپنی شان کے ساتھ موجود ہے۔ الہ آباد نہرو خاندان، سپرو خاندان، بچن خاندان، بہوگنا، فاروقی، کاٹجو، کیف وغیرہ کے لیے بھی مشہور ہے۔ اپنا کام کرنے کے بعد میں الہ آباد کی مشہور و معروف ہستیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوا اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اسٹیشن کے باہر خاصی بھیڑ تھی۔ اسٹیشن کے ایک طرف کثیر مسلم آبادی والا علاقہ ہے، جو کاٹجو روڈ اور نور اللہ روڈ سے کریلی تک پھیلا ہوا ہے۔ اسٹیشن کے دوسری طرف کینٹ علاقہ ہے جو صاف ستھرا اور قدرے بہتر ہے۔ اسی علاقے میں آنند بھون اور ہندوستانی اکیڈمی موجود ہے۔ اسٹیشن کے پاس ہی خسرو باغ ہے۔ ابھی پانچ بجنے والے تھے اور میری ٹرین نوچندی ایکسپریس کے روانہ ہونے میں کم از کم چالیس منٹ بچے تھے۔ اسٹیشن پہنچا تو میرے کانوں میں آواز آئی اور میں رک گیا۔

''الہ آبادی امرود...... کشمیر کے سیب ہیں سیب''

مجھے یاد آیا الہ آباد امرود کے لیے بھی مشہور ہے۔ میں نے بھی پانچ کلو وزن کا اضافہ کرلیا، دیکھنے میں بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ واقعی بعض کی رنگت اتنی لال تھی کہ دور سے سیب ہی نظر آرہے تھے۔ الہ آباد صوفی سنتوں کے لئے بھی اپنی شناخت رکھتا ہے۔ یہاں متعدد صوفیوں کے دائرے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے بھی الہ آباد کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس شہر نے کئی وزیر اعظم، وزیر اعلی، اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں اسٹار اور سپر اسٹار ہندوستان کو دیے ہیں۔

امرود کا ایک تھیلا اور ایک میرا بیگ۔ دونوں کو سنبھالے ہوئے میں جب ایک نمبر پلیٹ فارم پر پہنچا تو دیکھا ایک ٹرین مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ میں نے سمجھا شاید نوچندی ہے۔ میرا ریزرویشن بی۔ ون میں تھا۔ ڈبہ خاصا پیچھے تھا۔ برائے احتیاط میں نے ایک لال شرٹ پہنے نوجوان سے دریافت کیا۔

''بھیا یہ سنگم ہے یا نوچندی ــــ''

''یہ کچھ بھی ہو پر میں قلی نہیں ہوں۔''

وہ نوجوان تو آپے سے باہر ہونے لگا۔ میں نے معذرت کرلی۔

''معاف کرنا بھائی۔ غلطی ہوگئی۔''

اتنے میں، میں نے سنا کوئی کسی سے کہہ رہا تھا۔

''نوچندی 14 نمبر سے جائے گی ــــ سیدھے جاکر، بائیں گھوم جائیں اور پھر آگے چل کر دائیں۔''

بادل نخواستہ میں بھی مسافروں کے ہمراہ ہولیا۔ کاش ایک نمبر پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین ہی نوچندی ہوتی تو اتنی دور کی پیر توڑائی بچ جاتی۔ بیگ ذرا بھاری تھا۔ ایک کندھا جواب دینے کو تیار تھا جب کہ دوسرے ہاتھ نے امرودوں سے احتجاج کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا 10 منٹ کے اندر تیز چلنے، سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے کے بعد 14 نمبر پلیٹ

فارم کا بورڈ دکھائی پڑ گیا ورنہ میرے دونوں ہاتھ یقیناً بغاوت کر چکے ہوتے۔ پلیٹ فارم کی موجودگی نے میرے اندر نئی توانائی داخل کر دی تھی۔ کسی طرح گرتا پڑتا میں پلیٹ فارم اور پھر بی ون میں پہنچا۔ میری سیٹ اتفاق سے سب سے نیچے والی تھی۔ نیچے کی سیٹ میری کمزوری ہے۔ کھڑکی سے رابطہ بنا رہتا ہے۔ میرے کیبن میں چھ سیٹیں تھیں۔ ایک فوجی رنگروٹ بیٹھا تھا۔ لگ رہا تھا شاید تربیت کے بعد پہلی بار فوج میں شامل ہونے جا رہا تھا۔ پورے جسم میں فخر وانبساط کی لہریں موجزن تھیں۔ پانچ فٹ ۸ انچ کا نوجوان۔ سر پر صرف اتنے بال کہ بال والوں کے زمرے میں شامل ہو سکے۔ سنا ہے کہ فوجیوں کے بالوں کی کٹنگ بہت خطرناک ہوتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ بالوں کو بڑھنے دینا، دشمن کو طاقت پہنچانا ہے۔ چست درست ہلکے ہرے رنگ کا مخصوص لباس جسے دیکھ کر دور ہی سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فوجی ہے۔ فوجی، لڑکا یہی کوئی بیس اکیس سال کا ہوگا اور الہ آباد میں پہلی پوسٹنگ کے بعد میرٹھ اپنے گھر جا رہا تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی اسی وقت کیبن میں داخل ہو رہی تھی۔ ہاؤ بھاؤ اور لباس سے وہ کسی کالج کی طالبہ لگ رہی تھی۔ میرے پاس سے گذرتے ہوئے اس کے وزنی بیگ کا ایک حصہ مجھے مس کرتا ہوا گذر گیا تھا۔ مجھے ایک طرف کو جھکنا پڑا۔

''سوری سر!''

''کوئی بات نہیں____''میں نے اس کی خجالت مٹانے کو جواب دیا اور ایک سوال بھی کر ڈالا۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں____؟''

اس نے پہلے اپنا سامان سیٹ کے نیچے سیٹ کیا پھر، میرے سوال کا اطمینان بخش جواب دیتے ہوئے بولی:

''میں سبھارتی یونیورسٹی میں انجینئرنگ کے فائنل ائر میں ہوں۔ وہیں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔''

اس کے الفاظ، مسکراہٹ کے موتیوں سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے سننے والوں

تک پہنچ رہے تھے۔میرے جواب دینے سے قبل ہی فوجی نے اپنی ٹانگ اڑانی شروع کردی۔

''آئی ایم، موہن.....اینڈ گوئنگ۔۔میں میرٹھ جارہاہوں۔''

انگریزی بولتے بولتے فوجی کا ہندی پریم یا انگریزی کی کم علمی آڑے آگئی اور وہ ہندوستانی میں بولنے لگا۔لڑکی اس کی طرف مخاطب بھی نہیں تھی۔

''آپ کو پتہ ہے سب سے ذمہ داری کی نوکری فوج کی ہوتی ہے۔''

''سبھی نوکریاں ذمہ داری کی ہوتی ہیں۔ضرورت ایمانداری کی ہے۔رزق کو حلال بنانے کی ہے۔''میں خود کو جواب دینے سے روک نہیں سکا۔موہن ایک بار پھر لڑکی سے مخاطب ہوا۔

''ان وہچ برانچ آف انجینئرنگ، یوریڈ؟''

لڑکی نے مختصر سا جواب دیا۔

''آئی ٹی''

فوجی کو صحیح سنائی نہیں دیا۔

''پارڈن؟''

''انفارمیشن ٹیکنالوجی۔''

''او۔کے،دس از ریئلی جاب اوریئنٹڈ۔''

فوجی انگریزی بول کرلڑکی پر رعب ڈال رہا تھا۔

لڑکی اپنے بیگ سے کچھ سامان نکالنے لگی۔اتنے میں کمپارٹمنٹ میں چائے والے کی آواز گونجی۔

''چائے۔ڈپ ٹی....''

چائے میری کمزوری ہے۔مجھے ہر آدھے گھنٹے پر چائے ملتی رہے تو میں کبھی بھی انکارنہیں کرسکتا۔دراصل چائے کی یہ لت مجھے جمشید پور سے لگی۔جمشید پور میں بہت چائے پی جاتی ہے۔خصوصاً ہمارے چچا کے یہاں۔صبح ہونے کے بعد ہر آدھے گھنٹے میں،

زنان خانے سے چائے آتی رہتی ہے۔ آپ پییں یا نا پییں۔

''چائے دینا..... بھائی.......'' میں نے پیسے نکالے۔

فوجی کی آواز بھی آئی۔

''ٹو کپ ٹی.......''

میں نے دیکھا اس نے ایک کپ چائے لڑکی طرف بڑھائی، جسے کچھ تردد کے بعد اس نے قبول کرلیا تھا اور ایک کپ خود لے کر فوجی لڑکی سے باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمپارٹمنٹ میں ایک سردار جی اور ان کی بیوی بھی تھے۔ فوجی سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سبھی محسوس کر رہے تھے کہ وہ لڑکی میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ سفر تو سفر ہوتا ہے۔ سبھی مسافر ہوتے ہیں اور ایک مخصوص اسٹیشن تک ایک دوسرے کے ہم سفر ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ تر لوگ سفر میں ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ لڑکی جو شروع شروع میں مجھ سے باتیں کر رہی تھی اور فوجی سے دور دور تھی، بعد میں فوجی کی باتوں میں آنے لگی تھی۔ دونوں میں کچھ ہی دیر میں اجنبیت کے جالے صاف ہو گئے تھے۔

''یور نیم......؟'' فوجی نے پھر انگریزی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر عشق کے گھوڑے کو دوڑانا شروع کر دیا۔

''مائی نیم از۔۔ سنگیتا بجلانی __ '' لڑکی نے بڑی روانی میں انگریزی میں جواب دیا۔

''اوہ! دس نیم از.....اے ہیروئین.....'' وہ انگریزی میں لڑکھڑانے لگا تھا۔ پھر ہندوستانی بن گیا۔

''میرا مطلب ہے اس نام کی تو ایک ہیروئین ہوا کرتی تھی.....''

''ہوگی۔''

لڑکی نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا گویا وہ سنگیتا بجلانی نام کی کسی ہیروئین کو نہیں جانتی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ صحیح ہو۔ کیونکہ سنگیتا بجلانی کوئی بہت معروف اداکارہ نہیں تھی۔

اس کی شہرت تو بعد میں اظہر الدین سے شادی کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لڑکی کو اپنی توہین محسوس ہوئی ہو جب کہ وہ بہت خوبصورت، دراز قد اور پر کشش تھی، سنگیتا بجلانی سے اس کا موازنہ درست نہیں تھا، اسی لیے اس کا منہ بن گیا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا وہ ہندی فلمیں کم دیکھتی ہو۔

''سوری۔''

فوجی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تو راستہ ہموار کرنے پر توانائی صرف کرنا چاہتا تھا۔ پانسہ الٹتا دیکھ چالاکی سے بولا__

''سنگیتا جی، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ایک ہیروئین ہوا کرتی تھی، اس نام کی لیکن وہ آپ کے مقابلے کہیں نہیں ٹھہرتی....''

فوجی نے چاپلوسی اور تعریف کا مکھن لگانا شروع کر دیا تھا۔

سنگیتا کچھ نارمل ہوگئی تھی۔ موہن اب عاشقانہ خوشامد پر اتر آیا تھا۔ سنگیتا جی ویسے آپ کا نام ہے بہت الگ۔ جب آپ بولتی ہیں تو لگتا ہے سنگیت بج رہا ہے۔ ایک ایسا سنگیت جس میں کشش ہو اور جب آپ غصے میں بولتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا سنگیت سے بجلی سی چمک رہی ہو اور اس وقت آپ کی آواز کو بجلیوں بھرا سنگیت کہا جا سکتا ہے۔''

سنگیتا معاملہ سمجھ رہی تھی۔ بے وقوف نہیں تھی وہ۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''جی موہن جی۔ آپ کا نام بھی کتنا بھلا سا ہے۔ بالکل موہن سا، نام لیتے ہی ایسا لگتا ہے گویا موہنی سی صورت آواز میں ڈھل کر لفظ بن گئی ہے....''

''واہ سنگیتا جی، آپ نے تو کمال کر دیا۔ میرے نام کی ایسی ویا کھیا تو آج تک کسی نے نہیں کی۔''

''آگے بھی سن لیجئے موہن جی!'' وہ مذاق کے موڈ میں آ چکی تھی۔ آپ کا نام من موہن ہونا چاہیے تھا۔ یعنی من کو، دل کو موہ لینے والا........''

اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''سموسے گرم، سموسے........'' ٹرین شاید کسی اسٹیشن پر رکی تھی۔ سموسے والے کی آمد نے رومان پرور فضا کو تھوڑی دیر کے لیے مکدر کر دیا تھا۔ میں نے شیشے سے باہر جھانکا۔ اسٹیشن کا نام پڑھنا چاہتا تھا۔ اوہ یہ تو پرتاپ گڈھ ہے۔ مجھے دونوں کی گفتگو میں مزہ آنے لگا تھا۔ کہیں نہ کہیں میرے دل میں فوجی کے لیے حسد کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ دو ایک بار فوجی نے مجھے دکھانے کے لیے لڑکی کے قریب ہوتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بھی گفتگو کی تھی۔ میں تو بہر حال معاملے کی ابتدا ہی میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ لیکن ایک کسک دل کے کسی کونے میں زندہ تھی۔

موہن اور سنگیتا، بہت جلد گھل مل گئے تھے۔ دونوں نے اپنا مکمل تعارف بھی کرا لیا تھا۔ اب تو دونوں ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے۔ شاید ٹرین میں نہ ہوتے تو سارے ظاہری فاصلے خود شرما کر رفو چکر ہو جاتے۔ فوجی نے بہانے سے لڑکی کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔

''لائیے ہاتھ دکھائیے!''

لڑکی کی ابتدائی مزاحمت اور دوری، اب الفت و یگانگت میں بدل چکی تھی۔

''اچھا تو آپ پامسٹ بھی ہیں....'' وہ مسکرا پڑی تھی اور اس کی مسکراہٹ نے کمپارٹمنٹ کی بوجھل فضا کو خوش گوار بنا دیا تھا۔ سردار جی کی نظر بھی سنگیتا پر اٹک گئی تھی، ان کی بیوی، اپنے شوہر کی نظر پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

''اجی چھوڑو جی ــــ تم کیوں دیکھ رہے ہو ــــ'' بیوی سردار کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔

سردار جی ان دونوں کی محبت نگری سے تماشہ چھوڑ چھاڑ کر بیوی کے پہلو میں آ چکے تھے۔

''کیوں، پر ملا....؟''

''ہم نائٹ شو دیکھیں گے اور ہوٹل میں ٹھہریں گے۔'' بیوی بھی رومان آمیز ہوتی

جا رہی تھی۔ اسے سردار کا کسی لڑکی کو دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا جب کہ وہ خود اچھی خاصی تھی۔

''اوئے تسی پھکر نہ کر..... گڈی لکھنؤ پہنچنے دے۔ سیدھا فلم دیکھنے چلیں گے اور رات ہوٹل میں گذاریں گے۔ پھر صبح ملیح آباد جائیں گے۔ ڈن....'' سردار نے بڑے رومانس بھرے انداز میں، بیوی کا ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بیوی کا چہرہ سفید سے سرخ ہوتا چلا گیا۔

''ڈن'' اس کے منہ سے بھی نکلا اور اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''ارے آپ کے ہاتھ میں تو بے شمار دولت کی لکیر ہے۔'' موہن فوجی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا

''اور کیا کیا ہے__؟'' لڑکی نے اپنی کہنی پالتی مار کر بیٹھے موہن کی ٹانگ پر ٹکا دی تھی۔ ہتھیلی اب بھی موہن کی گرفت میں تھی۔ برق محبت کی ترنگیں تیزی سے سانسوں کے تار پر آنا جانا کر رہی تھیں۔ موہن کے جذبات میں گرم جوشی آ رہی تھی۔ سنگیتا کے دل کے بربط کے سارے تار بجنے لگے تھے۔ دونوں دریائے عشق میں ڈوب ابھر رہے تھے۔

''اور تعلیم کی بھی ریکھا ہے__ آپ کافی آگے جائیں گی۔''

''شادی.......کی لکیر بھی دکھائی دے رہی ہے...'' موہن نے غلط بیانی جاری رکھی جب کہ وہ پامسٹری کی اے بی سی ڈی سے بھی واقف نہیں تھا۔ وہ تو سنگیتا پر کچھ اس قدر فریفتہ تھا کہ کسی بھی طرح فاصلے مٹانا چاہتا تھا۔ شادی کی بات تو اس نے یوں ہی چھیڑ دی تھی۔

''ٹکٹ...'' سیاہ کوٹ پتلون پہنے، ایک ادھیڑ عمر کے ٹی ٹی ای نے ٹکٹ مانگا تو سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔

سب نے ٹکٹ دکھا دئے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں ایک بار پھر موہن اور سنگیتا کی سرگوشی اور ہنسی مذاق تیرنے لگے تھے۔ موہن سنگیتا کو رام کرنے کا کوئی حربہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''کھانا.....ڈنر.....'' ریلوے کینٹین کا ایک شخص آواز لگاتا ہوا ہر مسافر سے رات کے کھانے کا آڈر مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''ہاں...بھئی...ایک ڈنر، کب دو گے....آٹھ بجنے والے ہیں...''

صاحب....9/بجے تک مل جائے گا80/روپے دے دیجئے...''

میں نے پیسے نکال کر دیے، اس نے میری سیٹ کا نمبر نوٹ کر لیا۔ موہن فوجی نے دو ڈنر بک کرائے۔ گاڑی کی رفتار کم ہو گئی تھی....شاید کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ باہر روشنی ہونی شروع ہو گئی تھی۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ رائے بریلی اسٹیشن تھا۔ یہ رائے بریلی اور بریلی مجھے بہت دنوں تک پریشان کرتا تھا۔ لوگ بھی نہ جانے کیسے کیسے نام رکھ دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی تک ہوئی۔ بریلی کے آگے 'رائے' لگا دیا۔ ارے بھئی آپ کو اپنی رائے دینی تھی تو دے دیتے، سب کو رائے دینے پر مجبور کیوں کرتے ہو۔ پھر ستم یہ کہ نوچندی ایکسپریس بھی عجیب ہے۔ دونوں سے گذرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اب مسافر کنفیوژ بھی تو ہو سکتا ہے۔ رائے بریلی وہی شہر ہے جہاں سے آجکل سونیا گاندھی انتخاب لڑتی ہیں اور اردو کے مشہور شاعر منور رانا جسے اپنا وطن بتاتے ہیں۔ اور وہ بریلی ہے جس کے لئے فلم ''میرا سایہ'' میں گانا استعمال ہوا تھا۔

''جھمکا گرا رے۔۔۔ بریلی کے بازار میں۔۔۔ جھمکا گرا رے''

''سنگیتا.....ارے تم یہاں ہو...'' ایک خوبصورت لڑکی نے سنگیتا کو پکارا تو ہم سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہاں سیما۔ میری برتھ 32 نمبر ہے۔ تم کہاں ہو۔''

'' میں بی ٹو۔ میں ہوں۔''

پتہ چلا دونوں سہیلیاں ہیں اور میرٹھ ہی جا رہی ہیں۔ سیما کچھ دیر کے لیے سنگیتا کے پاس بیٹھ گئی تھی، دونوں سہیلیاں رازدارانہ گفتگو کرنے لگیں۔ سنگیتا نظریں بچا کر موہن کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ پھر سیما اٹھی اور جانے لگی__

''اچھا تو میں چلی۔صبح ملاقات ہوگی__ ''سنگیتا نے اپنی سیٹ چھوڑ دی تھی۔وہ سیما کو رخصت کرنے چلی گئی۔موہن اپنے موبائل پر گیم کھیلنے میں مصروف ہو گیا تھا۔سنگیتا آ کر بیٹھ بھی گئی تھی۔لیکن موہن کو احساس نہیں ہوا۔

''من موہن جی کہاں کھو گئے، مجھے یہ گیم ویم اچھے نہیں لگتے۔''موہن چونک پڑا۔اس نے موبائل ایک طرف رکھ دیا اور سنگیتا سے مخاطب ہوا۔

''سنگیتا، شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''موہن نے جب یہ سوال کیا تو سنگیتا پہلے تو شرما گئی۔پھر بڑے دلیرانہ انداز میں بولی__

''ابھی تک کوئی ملا نہیں تھا....لیکن اب سوچنا پڑے گا__ ''یہ کہتے ہوئے وہ موہن کو ایک ٹک دیکھتی رہی۔

''میرے پتا تو ہیں نہیں سنگیتا۔ماں پیچھے لگی رہتی ہیں۔جب سے میری نوکری لگی ہے ماں نے دباؤ بنانا شروع کر دیا ہے۔ماں نے کئی لڑکیاں دیکھیں پر کسی میں کوئی کمی تھی، تو کسی میں کوئی نقص۔تھک ہار کر انہوں نے یہ کام بھی میرے حوالے کر دیا__

''اب بیٹا تم ہی بتا دو...''

''ماں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔جب ملے گی میں بتا دوں گا۔''

اور سنگیتا کے جواب نے موہن کو آسمان میں پہنچا دیا تھا۔وہ تو بے حد خوش تھا۔سنگیتا کتنی خوبصورت، سلیقہ مند اور خوش گفتار تھی۔اس کی اور ماں کی پسند کو آج منزل مل گئی ہے۔وہ جاتے ہی ماں کو سمجھائے گا۔باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ سنگیتا، الہ آباد کی ہی رہنے والی ہے اور اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔اس کے والد بینک میں اچھی پوسٹ پر ہیں۔سنگیتا کا یہ آخری سال تھا۔یعنی موہن کے خوابوں کی دنیا جلد آباد ہو سکتی تھی۔وہ تو چھٹی لے کر ماں سے ملنے ہی جا رہا تھا۔ماں نے پچھلی بار سمجھایا تھا۔

''بیٹا شادی کی تیاری بھی کرتے رہو۔کچھ زیور تو میرے پاس ہے۔کچھ تم آہستہ آہستہ بنا لو...''اور وہ ماں کے کہنے پر الہ آباد سے ایک بہت خوبصورت سیٹ جو تقریباً پانچ تو

لے کا تھا، خرید کر لایا تھا۔ اس نے سنگیتا کو بھی اپنی باتوں میں شریک کر لیا تھا۔ سنگیتا تو بہت ہی خوش تھی۔ موہن نے تو اپنا بیگ کھول کر سیٹ اسے دکھا بھی دیا۔

''واہ! بہت خوبصورت ہے۔ جس کے گلے کی زینت بنے گا وہ محفلوں کی زینت ہوا کرے گی۔''

''دیکھئے.... کس کی قسمت میں ہے؟'' یہ کہتے ہوئے موہن نے سنگیتا کو عجیب نظروں سے دیکھا__

''کھانا... سیٹ نمبر 32... آپ بھی لیجئے.....''

موہن اور سنگیتا، میں، سردار جی اور ان کی بیوی سب کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے تھے۔ ایک لڑکا اور تھا جو خاموش سا بیٹھا کبھی اونگنے لگتا تو کبھی خراٹے بھرتا اور کبھی آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگتا۔ میں نے کھانا شروع کرنے سے قبل اس سے اخلاقاً پوچھا۔

''کھانا، کھا لیجئے......'' حیرت کی بات ہے کہ وہ لڑکا فوراً تیار ہو گیا۔ شاید بہت بھوکا تھا۔ میں نے اپنا کھانا اسے دے دیا۔ وہ جھجک رہا تھا۔ میں نے ایک اور کھانا منگوا لیا تھا۔ کھانے کے بعد مجھے چائے کی بہت للک لگتی ہے۔ سونے سے قبل چائے مل جاتی، سردار جی اور اس کی بیوی تیاری کر رہے تھے۔ شاید لکھنؤ آنے والا تھا۔ ۱۱ بجنے والے تھے۔ مجھے سکون ملا کہ لکھنؤ میں چائے مل جائے گی۔ لکھنؤ آ گیا تھا۔ اچھا خاصا اسٹیشن ہے۔ لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن نوابی طرز تعمیر کا اچھا نمونہ ہے۔ چار باغ کی طرف اسٹیشن کی شاندار، سفید گنبدوں والی عمارت۔۔ پلیٹ فارم نمبر ایک، لکھنو والوں کے دل کی طرح خاصا وسیع ہے۔

چائے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں پلیٹ فارم پر اتر گیا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے چائے والے کے پاس جا پہنچا۔ چائے لی اور ہلکی ہلکی چسکی لیتا ہوا واپس ہونے لگا۔ پلیٹ فارم نمبر ایک تھا۔ مسافروں سے بھرا ہوا۔ بڑی مشکل سے چلنے بھر کو جگہ مل پا رہی تھی۔ ہر طرف سونے والوں کے سر اور پیر تھے۔ کچھ ایک بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ کسی نے نیچے

اخبار بچھا رکھا تھا، تو کوئی یونہی لیٹا ہوا تھا۔ ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ۔ میں اکثر سفر میں سوچتا کہ یہ اتنی بھیڑ ٹرینوں اور اسٹیشنوں پر ہوتی ہے، کہاں کو جاتے ہیں یہ۔ یہ سب لوگ اگر سفر ترک کر دیں تو شاید انہیں گھروں میں رہنے کو جگہ ہی نہ ملے۔

گاڑی نے ہارن بجا دیا تھا۔ مسافر اپنے اپنے ڈبوں کی طرف دوڑ پڑے۔ میں ٹہلتا ٹہلتا اپنے کوچ کے سامنے پہنچ گیا تھا اور چائے کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔ جلدی سے پلاسٹک کا کپ ایک طرف اچھال کر، کوچ میں سوار ہو گیا۔ کمپارٹمنٹ میں الگ ہی سماں تھا۔ دو نئے مسافر آ گئے تھے۔ مڈل برتھ کھل گئی تھی۔ سفید چادروں نے الگ ہی منظر پیش کر دیا تھا۔ سنگیتا اور موہن درمیانی برتھ پر آمنے سامنے تھے۔ لیٹے لیٹے ہی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بستر لگایا۔ میں سونے سے پہلے ایک بار باتھ روم ضرور جاتا ہوں۔ باتھ روم سے آکر سامان چیک کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ لیٹتے ہی کچھ دیر بعد نیند کی پری مجھے پرستان لے گئی۔

اچانک ایک جھٹکے سے ٹرین رک گئی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اوپر دیکھا تو موہن اور سنگیتا کا رومان ہنوز انگڑائیاں لے رہا تھا۔ دونوں اب تک باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھ پر پھر نیند کا غلبہ ہو گیا۔

صبح پانچ بجے ایک شور کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ موہن کی آواز کیبن میں پھیل رہی تھی۔

''سنگیتا...سنگیتا...'' موہن بدحواس سا سنگیتا کو پکار رہا تھا۔

پتہ چلا سنگیتا کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ موہن کے بیگ اور موبائل کا بھی پتہ نہیں تھا۔

''ہائے، میں برباد ہو گیا....'' موہن کی درد بھری آواز نے پورے کمپارٹمنٹ اور آس پاس کے مسافروں کو جگا دیا تھا۔

میں حیران سا موہن فوجی کو دیکھ رہا تھا، جس کی دنیا لٹ گئی تھی۔ اردو کا سفر، انگریزی کا سفر بن گیا تھا۔ سنگیتا کے نام کا سنگیت اور گیت کہیں سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سنگیتا نے بڑی ہوشیاری سے موہن کے لائے ہوئے سیٹ کے لیے اپنی گردن کا انتخاب کر لیا تھا۔

موہن نے بی ٹو، میں جا کر سیما کا پتہ لگایا، تو پتہ چلا وہ کب کی ٹرین، پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی سیما سے باہر جا چکی ہے۔ وہاں بھی کئی موہن اپنا سر پیٹ رہے تھے۔

دو دن بعد سنگیتا اور سیما مجھے میرٹھ کے ایک ریسٹورینٹ میں ملیں۔ اور پھر ہم تینوں نئے سفر کی منصوبہ بندی کر کے رخصت ہو گئے۔

□□□

اسلم جمشید پوری کی کتابیں

1 : **افق کی مسکراہٹ 1997ء** : پہلا افسانوی مجموعہ، دوران تعلیم (پی ایچ۔ ڈی) بیسویں صدی ادارے سے شائع ہوا۔ مجموعے میں 10ر افسانچے اور تقریباً 20 افسانے شامل تھے۔ اس پر مغربی بنگال اور بہار اردو اکادمیوں نے انعام سے نوازا۔

2 : **ممتا کی آواز 1997ء** : بچوں کے لیے کہانیوں کا پہلا مجموعہ، مکتبہ پیام تعلیم، دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں کل 7 کہانیاں شامل تھیں۔

3 : **عقلمند لڑکا... 2000ء** : ایس آر سی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک ورک شاپ میں Neo literate کے لیے تیار کی گئی۔ با تصویر کتاب۔ اس میں کہانی بچوں کے تعلق سے دلچسپ بھی ہے اور مزے دار بھی۔

4 : **جاگتی آنکھوں کا خواب 2004ء** : کہانیوں کا انتخاب ہندی رسم الخط میں دہلی سے شائع ہوا۔ یہ دراصل میرے پہلے اردو مجموعے ''افق کی مسکراہٹ'' کا ہندی روپ ہے۔ کتاب کو ہندی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔

5 : **لینڈرا 2009ء** : میرا دوسرا افسانوی مجموعہ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا۔ اتر پردیش اردو اکادمی کا 15000ر روپے کا انعام حاصل ہوا۔ افسانے عام طور پر بہت پسند کیے گئے۔ تقریباً 30ر رسالوں میں تبصرے شائع ہوئے۔ درجن بھر تنقیدی مضامین بھی لکھے گئے۔ کئی یونیورسٹیز میں مقالے بھی لکھے گئے۔

6 : **دکھ نکلوا 2013ء** : لینڈرا، کا ہندی روپ 'دکھ نکلوا' کی شکل میں 2013ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کو ہندی کے معروف پبلشر روی پبلیکیشنز نے شائع کیا ہے۔ اس کی بھومیکا

معروف اردو ہندی اسکالر ڈاکٹر پردیپ جین نے لکھی۔ ہندی حلقے میں کتاب کا خاصا استقبال ہوا ہے۔

7 : **لینڈرا اور دیگر کہانیاں 2014ء** : عوام کی بے حد مانگ پر رحمٰن پاکٹ بکس، دہلی نے ''لینڈرا اور دیگر کہانیاں'' کی شکل میں لینڈرا کو پاکٹ بک ایڈیشن میں شائع کیا۔

8 : **کولاژ 2014ء** : میرے افسانچوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جسے عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس میں میرے اڑتیس افسانچے ہیں۔ افسانچوں کے علاوہ افسانچے کے فن اور اس کے آغاز و ارتقا کے تعلق سے میرا ایک طویل مضمون بھی شامل ہے۔

(ب) تنقید

9 : **جدیدیت اور اردو افسانہ 2001ء** : موڈرن پبلشنگ سے شائع ہوئی۔ اب تک اپنے موضوع پر لکھی گئی واحد کتاب ہے۔ کتاب میں شمس الرحمان فاروقی کے نظریۂ جدیدیت سے کھل کر بحث کی گئی ہے۔ جدیدیت کے مثبت اور منفی اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں طرح کے نمائندہ افسانوں کا مختصر تجزیہ اور جدیدیت پر ایک مباحثہ بھی شامل ہے۔ عنقریب ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ اردو اکادمی دہلی نے انعام سے نوازا اور کئی یونیورسٹیز میں شامل نصاب ہے۔

10 : **ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار 2002ء** : موڈرن پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہونے والی اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ڈاکٹر صادق کی کتاب سے الگ اپنی شناخت بنانے میں کامیاب اس کتاب میں سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر کو ترقی پسند افسانہ نگار ثابت کیا گیا۔ جس پر ادبی حلقوں میں خاصی بحث ہوئی۔ کئی جگہ شامل نصاب۔

11 : **اردو افسانہ تعبیر و تنقید 2006، 2007ء** : افسانے سے متعلق مضامین، چند مشہور و معروف افسانوں کے تجزیے اور افسانوی مجموعوں پر تبصرے پر مشتمل اس کتاب نے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کی۔ سال بھر بعد ہی دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن جلد شائع ہونے والا ہے۔ یہ کتاب بھی موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی۔

12 : **اردو فکشن۔ تنقید و تجزیہ** : میرے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ 2012ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس سے بڑے اہتمام سے شائع ہوئی۔ کتاب میں اردو افسانے اور ناول کے تعلق سے متعدد مضامین شامل ہیں۔ ساتھ ہی کئی ناول اور کئی افسانوں کے تجزیے شامل ہیں۔

13 : **تفہیمِ شعر 2014** : اردو شاعری کے تعلق سے میرے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جسے موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا۔ متعدد تحقیقی مضامین نئے نقطۂ نظر سے تحریر کیے گئے ہیں۔ مثلاً میر کی شاعری اور ماس کمیونی کیشن، شکیل بدایونی کی نظموں میں افسانوی عناصر، داغ کے مقطعوں مین زندگی کے رنگوں کی قوس قزح، شہریار کی نظمیہ شاعری : اردو نظم کا نیا موڑ، وغیرہ۔ بزرگ شعرار کرام کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے ممتاز شعرار کرام پر بھی مضامین شامل ہیں۔

(ج) تراجم

14 : **آدھا گاؤں 2003ء** : معروف فکشن نگار راہی معصوم رضا کے ناول کا اردو ترجمہ جب شائع ہوا تو اردو کے ادبی حلقوں میں خاصی ہلچل مچی۔ متعدد اردو والوں نے پہلی بار یہ ناول پڑھا۔ پاکستان میں بھی اس کا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں سرسوتی پستکالیہ، غازی پور سے شائع ہوا، ساہتیہ اکادمی کے ترجمہ ایوارڈ کے لیے کئی بار Panel میں شامل ہوا لیکن مصلحتوں اور سازشوں کا شکار ہوتا رہا۔

15 : **فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولس 2001ء** : معروف ہندی فکشن نگار محترم وی این رائے کی مشہور کتاب کا ترجمہ۔ کتاب میں ہندوستان میں ہونے والے فسادات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ فسادات کے تعلق سے ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

16 : **اکی .... 2002ء** : پروفیسر اصغر وجاہت کا معروف طویل ہندی ڈراما 'اکی' کا اردو میں ترجمہ۔ کئی اور کتابوں کے ترجمے کیے (ایک ٹکڑا دھرتی ایک ٹکڑا آکاش وی پی سنگھ، دہلیز کی آگ، نئی نظم نئے دستخط، نئی پاکستانی نظم وغیرہ۔)

نوٹ : ادبی بددیانتی کے چلتے یہ کتابیں میرے نام سے شائع نہیں ہوسکیں۔

(د) ترتیب وتالیف

17 : **آزادی کے بعداردوافسانہ Vol-I 2003**، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ارتضیٰ کریم کے ساتھ شراکت۔NCPUL سے شائع ہونے والی اردو۔ ہندی رسم الخط (آمنے سامنے) کی پہلی کتاب۔اس کتاب میں اردو کے شاہکار افسانوں انتخاب شامل ہے۔

18: **آزادی کے بعداردوافسانہ Vol-II 2003**، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ارتضیٰ کریم کے ساتھ شراکت۔NCPUL سے شائع ہونے والی اردو۔ ہندی رسم الخط (آمنے سامنے) کی پہلی کتاب۔اس کتاب میں اردو کے شاہکار افسانوں انتخاب شامل ہے۔

19 : **کائنات اردو 2004 Vol-I To VII**، :نرسری سے پانچویں تک کے طالب علموں کے لیے اردو کی مکمل سریز، محترم تصدق زیدی کے ساتھ ترتیب وتالیف۔

20 : **احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے 2007**،: احمد ندیم قاسمی کے انتقال کے فوراً بعد ان کے افسانوں کا انتخاب پہلی بار شائع ہوا۔انتخاب میں بی۔اے،ایم۔اے کے نصاب میں شامل افسانوں کو خصوصاً شامل کیا گیا ہے۔احمد ندیم قاسمی کے تقریباً سبھی معیاری اور معروف افسانے اس میں شامل ہیں۔موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا۔

21 : **تحریک آزادی 2008**،: پہلی جنگِ آزادی کی 1857، ڈیڑھ سو سالہ برسی کے موقع پر کرائے گئے شعبۂ اردو کے سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔اس میں آزادی اور اردو،آزادی اور میرٹھ،جنگِ آزادی میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے مجاہدین،علماء اور صحافی حضرات کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی نے شائع کیا۔

اسلم جمشید پوری کے فن اور شخصیت پر کتابیں

اسلم جمشید پوری بحیثیت افسانہ نگار: ایک جائزہ : تسنیم فاطمہ امروہوی کی یہ کتاب 2010 میں ایجوکیشنل پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوئی جسے 2011ء میں اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام بھی ملا۔ کتاب میں اسلم جمشید پوری کے افسانوں کے تجزیے مختلف نظریے اور بے باک لہجے میں کیے گئے ہیں۔ اسلم جمشید پوری کی سوانح اور ایک انٹرویو کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔

کہانی محل : پریم گوپال متل نے اسلم جمشید پوری کے دس نمائندہ افسانوں کا ایک انتخاب شائع کیا ہے۔ یہ **2012**ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی۔ کتاب میں 10/ افسانوں کے علاوہ خورشید حیات کا اسلم جمشید پوری کے افسانوں پر ایک تنقیدی مضمون ''کہانی مشک سے پھوٹتی خوشبو'' بھی شامل ہے۔

اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے : فرقان سنبھلی ، 2014 میں شائع ہونے والی اس کتاب میں میرے دیہات کے پس منظر میں لکھے گئے نو افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اردو میں دیہی افسانے کی روایت اور میرے افسانوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

عیدگاہ سے واپسی غالباً چوتھی یا پانچویں میں اردو کی کتاب میں 'عیدگاہ' کہانی پڑھی تھی۔ حامد کی معصومیت کا فولاد، چمٹے کی شکل میں ذہن کے کسی گوشے میں چپکا ہوا تھا۔ بی اے میں پھر 'عیدگاہ' پڑھی، اب کچھ اور تفہیم واضح ہوئی۔ پتہ چلا کہ کہانی صرف حامد اور دادی سکینہ کی بے مثل محبت کی ہی نہیں ہے بلکہ پورے اسلامی معاشرے اور تہذیب کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماجی تقسیم اور معاشی حالات کی غمازی کرنے والی کہانی ہے۔ ایک دن یوں ہی بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ آج اگر پریم چند زندہ ہوتے اور انہیں عیدگاہ لکھنی پڑتی تو وہ کیا لکھتے؟ ایک اور خیال آیا کہ عیدگاہ کی تخلیق کے ۷۰ سال بعد اگر از سر نو عیدگاہ تحریر کی جائے تو کیسا لگے گا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ عیدگاہ کے ۷۰ سال بعد ملک کے موجودہ حالات خصوصاً بابری مسجد شہادت، گجرات فساد اور روز بہ روز کے بگڑتے حالات میں عیدگاہ کو لکھوں گا۔ پھر ایک خیال آیا کہ پریم چند کی عیدگاہ کا منظر اور پس منظر شہر ہے، میں اسے دیہات کا پس منظر دوں تو کیسے لگے گا؟ اور ان تمام خیالات نے مل کر ننھے حامد کو ۷۰ سال کا بوڑھا بنا دیا اور اب وہ موجودہ حالات میں عیدگاہ کیسے جاتا ہے اور پھر کس طرح واپس آتا ہے۔ یہ سب 'عیدگاہ سے واپسی' میں آپ کو ملے گا۔

—اسلم جمشید پوری

Eidgaah Se Wapsi (A Collection of Short Stories)
by Aslam Jamshedpuri

arshia publications

A for Arshia Publications

arshiapublicationspvt@gmail.com